

# وقت کی دھول

#1 NEW YORK TIMES BESTSELLING AUTHOR

SIDNEY  
SHELDON'S

اقبال فرحت اعجازی

TILLY BAGSHAW



## ☆☆ سارنیں ایلر پھر کے لیے سٹنچ شیلٹن کا ایک خوبصورت ناول ☆☆

زائر بھائی! یہاں نہیں، ایک حقیقت ہے۔ ایک ایسی تاریخی حقیقت جس کو چھٹلانا ناممکنات میں سے ہے۔

میں خوابوں، رہائی داستانوں، خوبصورت مرغزاروں اور غزالی آنکھوں والی سرخ و سپید دوشیزاؤں کا ملک اسپین تاریخ کی طویل ترین خانہ جنگی کا گھر ہے۔ شاید یہ شرہ ہے امن ظہور و بربریت کا جو اسپین کے مسلم فاتحین کے ساتھ روا کرکھا گیا اور عام مسلمانوں کو تلوار کے بل بوتے پر عیسائی بنایا گیا۔ آج اسپین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جائیے۔ آپ کو مسلمانوں کی تعمیر کردہ مساجد ملیں گی۔ محلات، مکانات اور مقبرے نظر آئیں گے۔ ایسی تفریح گاہیں اور چراگاہیں دکھائی دیں گی جو پکار کر کہہ رہی ہوں گی کہ ہمارے خالق مسلمان تھے لیکن پورے ملک میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو البتہ متعدد ایسے خاندان ضرور مل جائیں گے جن کے افراد نفرت اور تحقیر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد مسلمان ہو کر تھے۔

چھوٹی موٹی خانہ جنگیوں سے قطع نظر، چوراسلامی حکومت ختم ہوتے ہی شروع ہو گئی تھیں، سب سے بڑے اور کبھی ختم نہ ہونے والی خانہ جنگی کی ابتدا ۱۹۳۶ء سے ہوتی ہے۔ حکومت اور طاقت کی حصول کے لیے جمہوریت پسندوں اور قوم پرستوں کے درمیان جو جنگ چھڑی، اس کے نتیجے میں صرف فروری سے جون تک کے درمیان پانچ لاکھ سے زیادہ افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے جن میں وہ دوسو بہتر سپاہی رہنماؤں کے قتل شامل نہیں ہیں جن کے پورے پورے خاندانوں کو گولیوں سے بھونک ڈالا گیا۔ اس فہرست میں ان ایک سو ساٹھ گراگھروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جو اس طرح جلا کر خاکستر کر دیے گئے کہ ان کے وجود تک کا احساس نہیں ہوتا۔ راہبازوں کو ان کی خانقاہوں سے جنہیں کاؤنٹ کہتے ہیں، زبردستی نکال کر جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ اس دور کا مشہور مورخ ڈک ڈی سینٹ سائمن اس خانہ جنگی کے نتیجے میں راہبازوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ”ان بیچاروں کو کانٹوں سے اس جھوٹے الزام کے تحت نکالا گیا کہ وہ طوائفیں ہیں، جنہوں نے ملک میں جگہ جگہ جسم فروشی کے اڈے قائم کر رکھے ہیں۔ اخبارات کے دفاتر میں تالے لگا دیے گئے۔ اسپین کے چپے چپے پر ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ فسادات کی ایسی گہما گہمی ہوئی کہ مرنے والا نہیں جانتا تھا کہ اسے کیوں مارا گیا ہے اور مارنے والے کو یہ علم نہیں تھا کہ اس نے کس کو کس جرم میں قتل کیا ہے۔“ قوم پرست فرانکو کی قیادت میں بالآخر ۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی خانہ جنگی ۱۹۳۹ء میں اختتام کو پہنچی لیکن ایک سال بھی نہیں گزر تھا کہ حریت پسندوں کے نام سے ایک نئی تنظیم ابھری، جس نے فرانکو کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر کے گوریل جنگ شروع کر دی۔ قوم پرستوں کے خلاف حریت پسندوں کی یہ جنگ آج بھی جاری ہے اور اس میں دونوں اطراف سے بے دردی کے ساتھ ہموں اور توپوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ پورے ملک میں قتل و غارتگری عام ہے۔ حریت پسند ٹینکوں کو لوٹ رہے ہیں تاکہ جنگ جاری رکھنے کے لیے ہتھیار خرید سکیں۔ قوم پرست حکومت اپنی ہٹا کے لیے ہر اس شخص کو جس پر حریت پسندوں سے متفق ہونے کا شبہ ہوتا ہے ایسی جیلوں میں ٹھونس دیتی ہے، جہاں شقاوت و بربریت کے سارے حربے آزمائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف حریت پسند قوم پرستوں کو چن چن کر اپنی گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ نہ کسی کی زندگی محفوظ ہے، نہ عزت و آبرو۔

۱۹۸۶ء میں، حریت پسندوں نے بارسلونا میں برسر عام اسپین کے جھنڈے کو نذر آتش کیا اور پامپلونا میں ہزاروں بے گناہ افراد فرنگ کے اس



بتادلے میں ہلاک ہوئے جو پولیس اور حریت پسندوں کے درمیان ہوئی۔ پھر اسپتال کا ایک شہر بھی ایسا ہی نہیں بچا۔ جہاں قوم پرستوں اور حریت پسندوں کے درمیان جھڑپیں نہ ہوئی ہوں۔ پولیس اور مظہری نے ہراس گھر، دکان اور عبادت گاہ کو پانی گولیوں سے ہجون ڈالا جس کے بارے میں اسے سخت تھکا کہ وہاں حریت پسند چھپے ہوئے ہیں۔

آج کا اسپتال دو نظریوں میں ٹھہرا ہوا ہے۔ قوم پرست اپنی حکومت کی ہٹا کی خاطر حریت پسندوں کو کچلنے میں مصروف ہیں جب کہ حریت پسند کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ جنگ جاری ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب تک جاری رہے گی۔ البتہ ایک بات سب جانتے ہیں کہ جب جنگ ختم ہوگی تب بھی ختم نہیں ہوگی اور کسی نہ کسی شکل میں جلد ہی دوبارہ شروع ہو جائے گی۔ مسلم حکمرانوں اور مسلم عوام کا خون اسی طرح رنگ لاتا رہے گا۔

زیر نظر کہانی جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا صرف کہانی نہیں، بلکہ ایسی تاریخی حقیقت ہے جسے کوئی شخص جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا کرداروں کے نام فرضی ہیں لیکن کردار، مقامات اور واقعات بڑی حد تک حقیقی ہیں۔

## ایک ایسی تاریخی حقیقت جسے کوئی شخص جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتا

والی ہر پرواز ہر ترین اور ہر بس مسلسل بل فائٹنگ کے شوقین افراد کو وہاں لے کر آ رہی تھی۔ تماشا بینوں میں ایسے افراد کی اکثریت تھی جو اپنی آنکھوں سے انسانوں اور جہینوں کے درمیان ہونے والی لڑائی کا مظاہرہ دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ جو اس میں عملی حصہ لے کر مر والی کا ثبوت دینے کے خواہش مند تھے اور کچھ وہ لوگ تھے، جو عملی حصہ تو لینا نہیں چاہتے تھے، تاہم ان کی خواہش تھی کہ جب خون خوار جانوروں کو شہر کی بڑی سڑک سے اسٹڈیم کی جانب ہٹا جائے تو وہ ان کے آگے آگے بھاگیں۔

ہوٹلوں کے کمرے ہفتوں پہلے ہی ہو چکے تھے، مقامی افراد نے اپنے گھروں کے کمرے منہ مانگے کرانے پر آنے والے غیر ملکیوں کے لیے خالی کر دیے تھے، اسکولوں اور کالجوں کو عارضی طور پر ہوٹلوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ مقامی پولیس کے ساتھ تعاون کر کے وہ شہر میں امن و امان کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہونے دیں۔ ہر چور چاہے سہ راہے دورا ہے، یہاں تک کہ ہر سڑک اور ہر گلی کے موڑ پر طلبہ و طالبات نے بڑی خوش اسلوبی سے ٹریفک کا انتظام سنبھال لیا تھا۔

شام کو بل فائٹنگ کا پہلا دور ہونا تھا جب کہ فائٹ کرنے والے خوفناک اور خون خوار جانوروں کو صبح کے وقت شہر کی بڑی سڑک سے ہٹا کر اس مقام تک پہنچانا تھا۔ جہاں سے انہیں شام کو اسٹڈیم میں آسانی سے منتقل کیا جاسکے۔ بل فائٹنگ کی طرح جانوروں کو ہٹا لے جانے کا منظر بھی قابل دید ہوتا تھا۔ ساری سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں تاکہ جانور دوسری طرف کا رخ نہ کر سکیں۔ بڑی سڑک پر جدھر سے جانور گزرتے تھے، فٹ پاتھوں پر فولادی کھانچے لگا دیے جاتے کہ تماشا بین

”اگر منصوبے میں ذرہ برابر بھی خامی رہے تو ہم سب کتے کی موت مارے جائیں گے۔“ حریت پسندوں کے لیڈر نجیبی مائیرو نے سوچا اور ایک بار پھر وہ دل ہی دل میں اپنے منصوبے کو جانچنے، پرکھنے اور اس کی خامیوں کو تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

نہیں، منصوبے میں کوئی کمی، خامی یا کمزوری نہیں تھی۔ صرف ہمت اور جرات کو بروئے کار لا کر، بڑی ہوشیاری سے منصوبے کو منتوں سیکھنے میں انجام دینا تھا۔ منصوبے کی کامیابی کا مطلب تھا کہ دنیا بھر میں اپنے خیالات، نظریات اور مطالبات کی بھرپور اشاعت جب کہ ناکامی کی صورت میں.....

”ناکامی کے بارے میں سوچنے اور پریشان ہونے کا وقت گزر چکا ہے۔“ نجیبی مائیرو نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ ”یہ کچھ کمزور کرنے کا وقت ہے۔ ہمیں ہر حال میں عملی قدم اٹھانا ہے۔“

نجیبی مائیرو اسپتال کے حریت پسندوں کا لیڈر اور قوم پرستوں کی حکومت کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ قد بھٹ، تلوانا جسم، دانش مند چہرہ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ چشم دید گواہ اسے اس کی جسامت سے زیادہ جہیم، طاقتور سے زیادہ طاقتور اور خوفناک سے زیادہ خوفناک بتایا کرتے تھے۔ وہ ایک ایسا عجیب و غریب انسان تھا۔ جس کے بارے میں بے شمار متضاد بیانات تھے۔ البتہ ایک بات پر سب متفق تھے کہ اپنے عقائد و نظریات کی خاطر وہ ہمہ وقت اپنی جان کو ٹھیلی پر لیے پھرتا رہا اور مرنے سے بالکل نہیں ڈرتا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پامیلونا کا پورا شہر، وہاں منعقد ہونے والی سالانہ بل فائٹنگ کی وجہ سے دیوانہ ہو چکا تھا۔ دنیا بھر سے تیس ہزار سے زیادہ تماشا بین پامیلونا پہنچ چکے تھے اور آنے

جانوروں کی ٹاپوں کی آوازیں، جن میں گاڑیوں کے شور، جانوروں کے آگے بھاگنے والوں کے نعروں اور فٹ ہاتھ پر کھڑے ہوئے لوگوں کی شاباش کی آواز بھی شامل تھیں، سنائی دیں۔ بچہ دادا کی گردن سے لپٹ گیا۔ اس کا ننھا سادل خوف اور مسرت کے باعث زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اچانک ایک طرف سے سڑک پر سرخ رنگ کا ایک ٹرک نمودار ہوا۔ اس سے چند افراد باہر نکلے۔ جنہوں نے فٹ ہاتھ پر لگے ہوئے کئی کھانچوں کو ہٹا کر بڑی سڑک کو اس طرح بند کر دیا کہ وہ چھوٹی سڑک جو جیل کی طرف جاتی تھی۔ آمد و رفت کے لیے ہل گئی۔ اس سے پہلے کہ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات صورت حال کو سمجھ کر کوئی دوسرا ہنگامی انتظام کرتے، پھرے ہوئے جانور، جن میں تین بیل اور چھ بھینسے شامل تھے۔ ننھوں سے بری طرح دھواں چھوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور آگے راستہ مسدود پا کر دوسری سڑک پر جانے کے لیے فٹ ہاتھ پر چڑھ گئے۔

.....☆☆☆.....

پامپلونا کی جیل میں راقل بردار محافظ پادری کی رہنمائی کرتے ہوئے کھڑ رہا تھا۔ ”یہاں کے انتظامات ایسے ہیں فادر! کہ پرندہ تک پر نہیں مار سکتا۔“ وہ پادری کو ایک ایسے مقام تک لے گیا۔ جہاں دھات کا ایک ڈیمکٹر نصب تھا۔ ایسے ڈیمکٹر اب ہوائی اڈوں پر عام ہیں۔ ”مجھے افسوس ہے فادر۔“ محافظ نے کہا۔ ”لیکن قانون کا احترام ہم سب کا فرض ہے۔“

”درست ہے، میرے بیٹے“ پادری نے جواب دیا اور اس جے سے گزرا۔ جہاں ڈیمکٹر تھا۔ ڈیمکٹر سے سائرن کی ایک تیز چیخنی ہوئی آواز نکلی۔ محافظ نے فوراً پادری پر راقل تان لی۔

پادری پلٹ کر مسکرایا۔ ”غلطی میری ہے۔“ اس نے کیا اور گلے میں پڑی ہوئی بڑی صلیب، جس کی زنجیر چاندی کی تھی، اتار کر محافظ کے حوالے کر دی۔ اس مرتبہ جب وہ ڈیمکٹر سے گزرا تو مشین پر سکون رہی۔ محافظ نے دوسری جانب جا کر پادری کی صلیب واپس کر دی اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں، فادر۔“

آگے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے اس کا موڈ فلسفیانہ ہو گیا۔ سر کو ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو فادر یہ سمجھتا ہوں کہ آپ یہاں محض اپنا قیمتی وقت برباد کرنے آئے ہیں۔ یہ وحشی ایسی روجیں ہی نہیں رکھتے، جن کی مغفرت اور نجات کے لیے دعا کی جائے۔“

فٹ ہاتھ پر محفوظ رہ کر ساری کارروائی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ پھر بڑی بڑی شور مچانی ہوئی گاڑیوں کے جلو میں جانوروں کو ہنگال دیا جاتا۔ پھرے ہوئے جانور بھاگتے اور ان کے آگے آگے من چلے جو ان پیچھے چلاتے اور انہیں اپنے اوپر حملہ آور ہونے کی دعوت دیتے ہوتے دوڑتے۔ اگر کوئی نوجوان کسی بھینسے کے بیٹگوں یا ٹاپوں کی زمین آ جاتا تو یونیورسٹی کے طلبہ فوری طور پر اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتے اور زخمی نوجوان کو ہاتھوں ہاتھ ایبویٹنس میں ڈال کر اسپتال پہنچا دیتے۔

ٹھیک پونے چھ بجے صبح کو اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ برق لباس والے بینڈ، بڑی سڑک سے گزرنا شروع ہوئے، جن میں طلبہ و طالبات نے جنسٹک کے کمالات دکھائے اور اکثر مقامات پر دل موہ لینے والے ناچ کا مظاہرہ بھی کیا۔ سات بجے توپ کے ذریعے گولا پھینک کر اعلان کیا گیا کہ دروازے کھولے جا رہے ہیں، اس لیے عوام سڑک کو جانوروں کے لیے خالی کر دیں۔ پانچ منٹ بعد گولا چھوڑا گیا کہ دروازے کھولے جاسکے ہیں۔ دو منٹ بعد تیسرے اور آخری گولے کی آواز آئی کہ جانوروں کو اسٹیڈیم کی جانب ہنگالے جانے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

سڑکیں دوسرے ہی گولے پر سنسان ہو چکی تھیں، سڑک کے فٹ ہاتھ لوگوں سے کھینچا کھینچا بھرے ہوئے تھے۔ کہیں بھی تل دھرنے تک کی جگہ نہیں تھی۔ من چلے نوجوان جو جانوروں کو لاکار کر ان کے آگے دوڑنا چاہتے تھے۔ فولا دی کھانچوں سے باہر نکل کر جانوروں کی آمد کے منتظر تھے۔

کھانچوں کے پیچھے، فٹ ہاتھ پر ایک چھوٹا سا بچہ اپنے بوڑھے دادا کے کندھوں پر بٹھنا بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ اس دلچسپ منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تاہم اسے تھوڑا سا ڈر بھی لگ رہا تھا۔

”ان لڑکوں کی طرف دیکھو۔“ دادا کہہ رہا تھا۔ ”یہ جانوروں کے آگے دوڑیں گے۔ ارے ان میں تو ایک لڑکی بھی ہے۔“ ”دادا۔“ لڑکا سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ ”ارے۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ تم تو یار بس یونی ہو۔ تم سے تو اچھی لڑکیاں ہیں۔“

”ڈر تو لگ رہا ہے، پر مزہ بھی بہت آ رہا ہے۔“ ”ما آنا بھی چاہیے۔“ بوڑھے دادا کا جواب تھا۔ ”جب میں جوان تھا تو اس وقت میں بھی جانوروں کے آگے آگے دوڑتا تھا۔ اس سے زیادہ مزے کی بات کوئی تھی ہی نہیں۔ اس طرح ہم اپنی مردانگی کو موت کے خلاف آزماتے ہیں۔“

لوگوں کے گھروں میں آگ بھی لگائی ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اپنے سارے گناہوں کا جو مجھے یاد ہیں اور ان گناہوں کا جنہیں میں بھول چکا ہوں، اعتراف کرتا ہوں۔“  
 ”بس اتنا کافی ہے۔ یسوع مسیح تم پر رحم فرمائیں۔“  
 ”آمین۔“

پادری مجرم سے گناہوں کا اعتراف کروا کے کوٹھری کے دروازے پر پہنچا، محافظ نے تالا کھول کر اسے باہر نکالا اور کوٹھری کو مقفل کر کے اگلی کوٹھری کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اس دوسرے جہنمی کو بھی جنت میں پیچھے کی کوشش کر ڈالیے۔“  
 دوسری کوٹھری میں گندے فرش پر بیٹھے ہوئے شخص نے مخاطب ہو کر پادری نے کہا۔ ”میرے بیٹے تمہارا نام کیا ہے؟“  
 ”فلینکس کارپیو۔“ جواب ملا۔ یہ پہلے مجرم سے بھی زیادہ مار کھایا ہوا تھا۔ چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ لیکن اس کی داڑھی بھی اس کے رخسار کے تازہ زخم کے نشان کو پوری طرح نہیں چھپا سکتی تھی۔ زخم سے خون رس رہا تھا۔ ”میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں، فادر!“

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے بیٹے۔“ پادری نے جواب دیا۔  
 ”ایسی چیز سے کیا ڈرنا جس کا دیر یا بدیر ہم سب کو سامنا کرنا ہے۔“

جس وقت کارپیو پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا تھا۔ جیل کے باہر شور غل کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑا ہنگامہ برپا ہو۔ محافظ نے کچھ دیر تک ان آوازوں و سنا۔ آوازیں فریب سے قریب تر آتی چلی جارہی تھیں۔ پریشان ہو کر وہ کوٹھری کے مقفل دروازے پر پہنچا اور تالا کھولتے ہوئے بولا۔

”جلدی کریں فادر۔ باہر کوئی بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔“  
 ”میرا کام ختم ہو چکا ہے۔“

پادری باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ محافظ کوٹھری میں دوبارہ تالا لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”باہر کے شور غل کی آوازیں سن رہے ہیں فادر! ان آوازوں میں ڈراؤ خوف شامل ہے۔“  
 ”شاید کچھ لوگ ہم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ کیا میں یہ مستعار لے سکتا ہوں؟“  
 ”مستعار؟ کیا؟“  
 ”تمہاری راتفل!“

پادری جملہ مکمل کرتے ہی تیزی سے محافظ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے بڑے سکون سے گلے میں پڑی ہوئی صلیب اتاری اور اس سے پہلے کہ محافظ کچھ سمجھتا، اس نے ایک سرے

”مغفرت اور نجات کی دعا سب کے لیے کی جاتی ہے میرے بیٹے۔“

”مگر مجھے یقین ہے کہ ان دونوں کے لیے دوزخ کے دروازے کھولے جا چکے ہوں گے اور بے شمار جہنمی انسان انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے تیار کھڑے ہوں گے۔“

پادری نے حیرت سے محافظ کی طرف دیکھا۔ ”دونوں کے لیے یقین مجھ سے تو یہ کہا گیا ہے کہ تین مجرموں کی نجات کے لیے دعا کرنا ہے۔“

”تین ہی تھے۔ لیکن قدرت نے آپ کا تھوڑا سا دقت ضائع ہونے سے بچالیا ہے۔ زمرور نامی مجرم آج صبح چھائی کے خوف سے حرکت قلب بند ہونے کے باعث چل بسا۔ لیجیے فادر، پہلی کال کوٹھری آگئی۔“

محافظ نے کوٹھری کا تالا کھولا اور ایک طرف ہٹ کر پادری کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ پادری اندر چلا گیا تو اس نے دروازے کو دوبارہ باہر سے مقفل کر دیا اور اینٹیشن ہو کر کھڑا ہو گیا۔  
 پادری جیل کے گندے، بدبودار فرش پر پڑے ہوئے شخص کے پاس پہنچا۔ ”تمہارا نام کیا ہے بیٹے؟“  
 وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”ریکارڈو میلادو۔“

پادری نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ مجرم کا چہرہ بہت زیادہ مار کھانے کے باعث سوجا ہوا تھا۔ ناک سے خون بہہ کر تختوں پر جم گیا تھا اور پیوٹے پھول جانے کے باعث آنکھیں بھٹک آ دی تھیں۔

”میں آپ کا احسان مند ہوں کہ میرے آخری وقت میں آپ نے مجھے یاد رکھا اور یہاں آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔“  
 ”ہر جانے والے کی مغفرت اور نجات کی دعا میرے فرائض منصبی میں شامل ہے، میرے بیٹے!“

”آپ کو علم ہے کہ چند گھنٹوں بعد مجھے پھانسی دے دی جائے گی؟“

پادری نے پیار سے اس کے کندھے کو تھپا ہوا۔ ”دستور یہی ہے کہ جو کچھ ہووے گا وہی کاٹو گے۔ یہ وقت تو بہت کا ہے، سچے دل سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو۔ ہو سکتا ہے کہ یسوع مسیح جو دنیا کے لیے نجات دہندہ بن کر آئے تھے۔ تمہاری توبہ قبول فرمائیں۔“

”فادر۔“ ریکارڈو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں بے حد بڑے حساب گناہ کیے ہیں۔ جن میں برے اور گندے خیالات کے گناہ بھی شامل ہیں اور بڑے اور گندے کاموں کے گناہ بھی۔ میں نے قتل بھی کیے ہیں اور

کے ڈھکنے کو ہٹایا، ڈھکنا ہٹتے ہی آب دار شمشیر نمودار ہوئی جو پلک جھپکنے میں محافظ کے سینے میں اتر گئی۔

بادری نے فرش پر گرے ہوئے محافظ کو سہارا دے کر اس کی رانفل حاصل کی۔ پھر دم توڑتے اور خون اگلنے ہوئے محافظ کو ایک دھکے سے فرش پر پھیل دیا۔

”میرے بیٹے!“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں نے اور میرے خدا نے طے کر لیا تھا کہ تم سے زیادہ مجھے اس رانفل کی ضرورت ہے۔“

محافظ نے بمشکل فرش سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھنے اٹھتے ڈھیر ہو گیا۔ پادری نے جھک کر اس کے ہاتھ سے کنبیوں کا گچھا چھین لیا اور دونوں کال کنبھریوں کے تالے ہول دیے۔ باہری آوازیں اور زیادہ تیز ہو گئیں۔

”چلو!“ اس نے دونوں مجرموں سے کہا۔

ریکارڈو نے اس کے ہاتھ سے رانفل لے لی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہی! تم نے غضب کا مجھیں بدلا ہے۔ سچ پوچھو تو پہلی نظر میں، میں بھی تمہیں نہیں پہچان رہا تھا۔“

”ظالموں نے تم دونوں کی خوب دھنائی کی ہے۔“ جیسی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”انہیں اس کی قیمت چکانا پڑے گی۔“

پہلے برآمدے سے نکل کر تینوں دوسرے برآمدے میں پہنچے۔ جیل کا وہ حصہ جہاں صرف پھانسی پانے والوں کو پھانسی سے پہلے منقل کیا جاتا تھا۔ سنسان پڑا تھا۔

”زمورا کیسے مرا؟“

”گزشتہ شب اسے بری طرح زد و کوب کیا گیا۔ زمورا ہماری طرح سخت جان نہیں تھا۔ مار پیٹ کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ ظالموں نے یہ کہہ کر کہ پھانسی کے خوف سے اس کی حرکت قلب بند ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ لے لیا اور اس کی لاش کو مردہ خانے میں پھینکوا دیا۔“

آگے آہنی گیٹ تھا۔ جیسی نے کہا۔ ”تم دونوں یہیں ستون کی آڑ میں ٹھہرو۔“ پھر وہ گیٹ پر گیا اور دوسری جانب کھڑے ہوئے محافظ کو مخاطب کیا۔ ”میں فارغ ہو چکا ہوں۔ خداوند خدا پھانسی پانے والوں کو کجانت ابدی عطا فرمائے۔“

محافظ نے، جس کے پاس چھوٹی مشین گن تھی، گیٹ کھولا۔ ”جلدی کرو فادر! باہر نہیں گیا گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کہیں کسی دشمن نے...“ اس کا جملہ مکمل نہیں ہو سکا۔ جیسی کی صلیبی شمشیر اس کے دل کو چیرتی ہوئی آ رہا ہو گئی۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ”آ جاؤ۔“

فیلکس کاربیو نے محافظ کی مشین گن پر قبضہ کر لیا۔ ان کا خیال

تھا کہ کچھ دیر بعد جیلر اور جیل کے سپاہیوں سے دوبارہ ہو کر جنگ لڑنا پڑے گی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ باہر شور وغل کا طوفان آیا ہوا تھا۔ پولیس والے حیران و پریشان ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے تھے اور چیخ چیخ کر لوگوں کو، جو پھیرے ہوئے جانوروں سے بچنے کے لیے تیل میں پناہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑے گیٹ کی جانب جانے سے منع کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک تیل نے سینگ کی ٹکڑ سے گیٹ کے ایک ستون کو پاش پاش کر ڈالا۔ اس کے عقب میں آنے والے بھینسے نے محافظ کے پیٹ پر ایسی ٹکر ماری کہ وہ دونوں سینگوں میں پھد کر رہ گیا۔ بھاگ دوڑ، چیخ پکار اور ہڑبونگ کی گنا بڑھ گئی۔ جس کا جدر منہ اٹھا۔ اس نے اسی جانب بھاگنا شروع کر دیا۔

سرخ ٹرک گیٹ سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ہڑبونگ میں تینوں افراد اس کی طرف دوڑے۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ انہیں فرار ہوتے دیکھتا۔ جن دو چار کانشیبلوں نے دیکھ لیا، انہوں نے بھی آنکھیں چرائیں۔ انہیں اپنی زندگیاں زیادہ عزیز تھیں۔ وہ تینوں ٹرک کے پچھلے حصے میں کود گئے۔ ٹرک جو پہلے سے اشارت تھا۔ تیزی کے ساتھ کھڑے ہوئے پریشان حال لوگوں میں راستہ بنانا ہوا پلک جھپکنے میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

پولیس فوج اور رضا کار دستوں کی صورت میں خوف اور دہشت کے ساتھ بھاگنے والوں کے جم غفیر پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھی اور کم دیش سبھی اپنے آپ کو بے بس یا رہے تھے۔ لوگ ہر سمت سے بھاگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر سڑک اور ہر گلی میں سینکڑوں کی تعداد میں خوفناک بیل اور بھینسے گھس آئے ہوں اور لوگوں کو اپنے سینگوں سے ختم کرتے پھرتے ہوں۔ بیلوں اور بھینسوں سے اتنا نقصان کہیں پہنچا۔ جتنا نقصان بھاگنے والوں نے اپنے آپ کو پہنچایا۔ خاص طور پر عورتیں، بچے اور بوڑھے لوگ بھاگنے والوں کے پیروں تلے اس طرح روندے گئے کہ انہیں پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔ کچلے جانے والوں میں وہ بوڑھا بھی شامل تھا۔ جو خاص طور پر اپنے پوتے کو کندھے پر بٹھا کر بہادری اور مردانگی کا مظاہرہ دکھانے کے لیے لے کر آیا تھا۔ معصوم پوتا بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔

کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیسی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ منصوبہ اتنا کامیاب اور اتنا خوشی ثابت ہوگا۔ عوام بے چارے خواہ مخواہ مارے گئے ان سے تو ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی۔“

فیلکس کارپو نے گہری آہ بھر کر کہا۔ ”اس دنیا کا دستور یہی ہے گیہوں کے ساتھ کن، ہمیشہ سے پستے آتے ہیں۔“  
 ”جیسی!“ چند لمحوں بعد ریکارڈو روڈو میلادو نے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”شہر سے باہر نورے نامی دیہات میں ایک محفوظ مکان پر ہم وہاں شام تک ٹھہریں گے اور تاریکی پھیلنے ہی آگے روانہ ہو جائیں گے۔“

نصف گھنٹے کے مزید سفر کے بعد نورے آگیا۔ ڈرائیور اور جیسی نے سہارے کردووں ساتھیوں کو ٹرک سے نیچے اتارا۔  
 ”رات کو کب تک یہاں پہنچ جاؤ؟“ ٹرک ڈرائیور نے پوچھا۔

”زیادہ سے زیادہ نو بجے تک۔“ جیسی نے کہا۔ ”اپنے ساتھ کسی ڈاکٹر کو ضرور لانا تاکہ وہ فیلکس اور ریکارڈو کی مرہم پٹی کر سکے۔ اور ہاں، جتنی جلدی ہو سکے، اس ٹرک سے نجات حاصل کر لیں۔ شور و غوغا ختم ہوتے ہی ملٹری اور پولیس سرخ ٹرک کی تلاش شروع کر دے گی۔“

ٹرک چلا گیا تو تینوں مکان کی طرف بڑھے۔ ریکارڈو نے کہا۔ ”میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جن کے ذریعے تمہارا شکر بے ادا کروں۔ تم نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔“

”مجھے یقین تھا جیسی!“ فیلکس نے کہا۔ ”تم میری مدد کے لیے ضرور آؤ گے۔ پھاسی کے تختے پر کھڑا کر کے میرے گلے میں رسی کی کا پھندا ڈال دیا جاتا۔ تب جیسی میرے یقین میں کوئی کمی نہ آتی۔“

جیسی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا صحن میں لٹکے ہوئے پیئیرے کے پاس پہنچا، جس میں ایک خوبصورت مینا چھپا چھپا رہی تھی۔ اس نے پیئیرے کی کھڑکی کھول کر مینا کو باہر نکالا اور آہستہ سے اسے فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”ہر زندہ مخلوق کو آزاد رہنا چاہیے۔“

☆☆☆☆

وزیر اعظم لیو پلڈو مارٹینیز کی سرکاری قیام گاہ پر کابینہ کے وزراء، معتمدین اور اعلیٰ افسران کا ہنگامی اجلاس ہو رہا تھا اور وزیر اعظم اپنی میز پر گھونے مار مار کر کہہ رہے تھے۔ ”کل ایک اکیلے جیسی مایور نے پورے پاپیٹو کا میدان جنگ بنا کر جیل کے دو محافظوں کو قتل کیا اور اپنے دو دہشت پسند ساتھیوں کو جیل سے نکال کر فرو چکر ہو گیا۔ متعدد بے گناہ افراد، جن کی تعداد سو سے

تجاوز کر چکی ہے، ہماری ذرا سی غفلت سے جانوروں کا راستہ بدل دیے جانے کے باعث بیڑوں تلے آ کر خلع گئے۔ بلاناظ ہے ہمیں اپنی اس عقل و فراست پر جو جیسی مایور کی عیاری کے سامنے دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے جب بھی پوچھا۔ جس وزیر یا جس افسر سے پوچھا سب کا ایک ہی جواب تھا کہ بہترین انتظامات کیے گئے ہیں۔“

سارے افراد دم بہ خود بیٹھے تھے۔ کسی کی اتنی جرات نہیں تھی کہ وزیر اعظم سے آنکھیں چار کرتا۔ انتظامات تو بلاشبہ بہترین تھے۔ یہ کسے معلوم تھا کہ دہشت پسند جانوروں تک کو اپنے ناپاک عزائم کی خاطر استعمال کر ڈالیں گے۔

”جو ہونا تھا، ہو چکا۔“ وزیر اعظم کچھ دھیمے بڑے۔ ”متعلقہ افسران کو معطل کیا جا چکا ہے لیکن اس کاغذی کارروائی سے کیا حاصل ہوگا؟ جیسی مایور کے لگائے ہوئے زخم اس وقت تک مندرجہ نہیں ہوں گے جب تک اسے اور اس کی علیحدگی پسند تحریک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم نہ کر دیا جائے۔ ہماری طاقتوں سے اس کے حوصلے کتنے ہی بلند کیوں نہ ہو گئے ہوں مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم گورنمنٹ میں ہیں اور ہمارے ذرائع محدود ہیں۔ ہمارا اور اس کا مقابلہ شہر اور مینے کا مقابلہ ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو اپنی طاقت اور ذہانت کو بروئے کار لائے اس مینے کو گرفتار کرے اور اپنی ایک بار پھر امن وامان کا گہوارہ بنادے؟“

وزیر اعظم کی دانیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے دھیمے اور پر عزم لہجے میں کہا۔ ”میں اسے گرفتار کروں گا۔“

یہ الفاظ کرل ریبن کوکا کے منہ سے ادا ہوئے تھے جو ملک کی سیکرٹ سروس گونے کا سربراہ تھا۔ گونے کی تنظیم سن ساتھ عیسوی میں ان دہشت پسندوں کے لیے جو اپنے آپ کو حریت پسند کہتے تھے قائم کی گئی تھی اور اس تنظیم نے ہزاروں کی تعداد میں دہشت پسندوں کو قانونی اور غیر قانونی دونوں طرح دوسری دنیا میں بپنچا دیا۔ کرل کوکا اور ہیزمرکاد پوچھے جسم، ہیبت ناک اور سرد مہر چہرے والا انسان تھا۔ جس نے پچھل خانہ جنگی میں بھرپور انداز میں حصہ لیا تھا۔ دنیا سے سفاک اور جلا جیسے خطابات سے یاد کرتی تھی جب کہ وہ ان خطابات پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے بڑے فخر سے کہا کرتا تھا۔ ”میں صرف خدا اور تاریخ کے سامنے جواب دہ ہوں۔ میرا فیصلہ ہی دونوں کریں گے کہ میں اپنی قوم اور اپنی حکومت کا کس حد تک وفادار تھا۔“

وزیر اعظم اور ان کی کابینہ نے سوچا اور ٹھیک ہی سوچا کہ دہشت پسندی کو ختم کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ دہشت پسندوں



اوہلا کے کانوں میں، جسے چار سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ چہروں کے تبدیل ہونے کے علاوہ کوئی دوسری تبدیلی عمل میں نہیں آئی تھی۔ وہاں کی مکین عورتیں سسز کھلائی تھیں اور ان کے پاس ان کی اپنی کوئی خاص ذاتی چیز نہیں ہوتی تھی۔ رنگ اور عمر کے امتیاز کے بغیر ساری سسز خود کو یسوع مسیح کی بیوی سمجھتی تھیں اور یسوع مسیح کے امتیاز میں غربت اور عسرت کو نعمت بے بہا گردانتی تھیں۔ پورے کانوں میں ٹھوس سوئے کی ایک صلیب کے علاوہ جو ایک امیر عقیدت مند کا عطیہ تھی، سونے یا چاندی کی کوئی دوسری چیز نہیں تھی۔ اس پیش قیمت صلیب کو ایک کینٹ میں کپڑا لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ لکڑی کی ایک بڑی اور سادہ سی صلیب کانوں کے گیٹ پر نصب تھی۔

وہ راہباں جنہوں نے اپنے آپ کو یسوع مسیح کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ایک ساتھ رہتی تھیں، ایک ساتھ کام کرتی تھیں، ایک ساتھ کھاتی تھیں اور ایک ساتھ عبادت کرتی تھیں لیکن انہیں ایک دوسرے کے جسم کو چھونے یا ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بولنے کی اجازت اس وقت ملتی تھی، جب کسی مذہبی تہوار پر کوئی تقریب ہوتی تھی یا ان کی نگران عزت مآب مادر بیٹیا اپنے دفتری تنہائی میں ان میں سے کسی کو کوئی نصیحت کرتی تھیں اور اس خلوت میں بھی کوشش یہی کی جاتی تھی کہ زبان کو کم سے کم استعمال کیا جائے اور اشاروں میں گفتگو کی جائے کیونکہ زبان تو صرف حمد و ثناء کے لیے مخصوص تھی، اس سے دنیاوی کام لینا بڑی گھناؤنی حرکت تھی۔

عزت مآب مادر بیٹیا ستر سال کی خاتون تھیں جن کے پلکوں سمیت سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ بچپن ہی میں کانوں میں آگئی تھیں اور وہاں کی پرسکون زندگی سے مطمئن تھیں۔ ان کی زندگی یسوع مسیح کے لیے وقف تھی اور ان کی یادیں انہیں جو قلبی اطمینان محسوس ہوتا تھا اس کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں بچھ تھیں۔ غصہ کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں تھا۔ البتہ اگر کسی راہبہ سے کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو وہ رو پڑتی تھیں اور کانوں کے ڈسپلن کی خاطر راہبہ کو سزا بھی دیتی تھیں۔

راہباں میں کانوں میں اوپر نیچے گھومیں لیکن ان کی نظریں ہمیشہ نیچے کی سمت جھکی رہتیں اور بڑی آستینوں کے لباس میں دونوں ہاتھ آستینوں میں چھپے ہوئے سینوں پر رکھے رہتے۔ وہ اپنی دوسری سسز کے پاس سے خاموشی کے ساتھ کچھ بولے، کوئی اشارہ کیے یا ان کی طرف دیکھے بغیر گزر جاتیں۔ کانوں میں صرف ایک ہی آواز گونجتی تھی اور وہ آواز بھی وہاں کی گھنٹیوں

کے لیڈر جیسی مائروگرفارکر کے بغاوت کے الزام میں برسر عام پھانسی دے دی جانے اور یہ بھی سوچا اور یہ بھی ٹھیک ہی سوچا کہ پورے اسپین میں صرف ایک ہی شخص ہے جو لومڑی جیسی عیاری اور جھٹپٹ جیسی تیزی اور شیر بہر جیسی خون خواری کے ساتھ جیسی مائروگرفارکر رسکتا ہے اور وہ شخص خود ہی قوم اور حکومت کے مفاد میں اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔

طے ہو گیا کہ یہ کارنامہ کرنل اوکا انجام دے گا اور جیسی مائرو کے ختم ہوتے ہی نام نہاد حریت پسندی کی دہشت پسند تحریک ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائے گی۔

کرنل نے کہا۔ ”آپ لوگوں نے مجھ پر اعتماد کر کے جو اعزاز بخشا ہے، اس کے لیے تہنود سے آپ سب کا شکر ہے اور کرتا ہوں۔ اب مجھے اتنی اجازت اور دیکھیے کہ میں چند نکلے تھاق سے آپ کو آگاہ کروں میں شروع سے جیسی مائرو کی تحریک کا جائزہ لیتا چلا آ رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہمارے چرچ جیسی مائرو کا ساتھ نہ دیتے تو یہ تحریک اس طرح پروان نہ چڑھتی۔“ وزیر اعظم نے فور سے کرنل کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ چرچ باغیوں کی مدد کر رہے ہیں؟“

”انتہائی یقین ہے جناب عالی، جتنا اپنے وجود پر ہے۔“ ایک بار پھر پورے ہال پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ اس سکوت کو کرنل اوکا کی مدھم مدھم بھڑی بھر کم آواز نے توڑا۔ ”جو چرچ دہشت پسندوں کو پناہ دے رہے ہیں، وہ سزا کے مستحق ہیں۔“

پھر وہی خاموشی۔ چند لمحوں بعد وزیر اعظم نے دریافت کیا۔ ”ابتدا کہاں سے کرو گے؟“

”میری اطلاعات کے مطابق کل رات گئے جیسی مائرو اور اس کے ساتھیوں کو اوہلا کے قصبے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔ وہ لوگ وہاں کے کانوں میں مقیم ہوں گے۔“

وزیر اعظم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا کہ کانوں میں صرف وہ عورتیں رہتی ہیں، جو ساری زندگی کنواری رہ کر عبادت و ریاضت کرتی ہیں۔ باہر ہی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سیاست تو دور کی چیز ہے، وہ تو یہ تک بھول چکی ہوتی ہیں کہ کانوں کے باہر کسی ہستی ہستی ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ بالاخر اس نے کہا۔ ”اگر تمہیں یقین ہے تو اوہلا کی تلاشی لو۔ مجھے ہر قیمت پر جیسی مائرو چاہیے۔“

وزیر اعظم کے اس فیصلے نے پورے اسپین کو المناک حادثات اور سانحات کی ایک ایسی زنجیر میں برودیا۔ جس سے نہ صرف پورا ملک لرز اٹھا بلکہ پوری دنیا کو بھی سخت ترین صدمہ پہنچا۔

کی۔ ایسی ہی سیریلی آوازوں کو مشہور مصنف وکٹر ہیگو۔  
 ”عبادت گاہ کے نقص“ کی آواز سے تعبیر کیا کرتا تھا۔  
 راہباں کی مختلف ممالک اور مختلف پس منظر والی تھیں۔ ان کے  
 خاندانوں کا تعلق سرکاری ملازمین یا کسانوں یا فوجیوں وغیرہ  
 سے تھا۔ آنے والیاں امیر بھی تھیں، غریب بھی۔ تعلیم یافتہ بھی  
 تھیں اور جاہل بھی۔ پریشان حال بھی تھیں اور شکرانی ہوئی بھی۔  
 لیکن اب کانٹ میں آنے کے بعد خدا کی نظروں میں سب  
 برابر ہیں اور سب یسوع مسیح کی بیگمات تھیں۔ جنہیں دوسری دنیا  
 میں ہمیشہ کی زندگی یسوع مسیح کی چھیتی بیگم بن کر گزارنا تھی۔  
 کانٹ کی سردیاں چاقو کی طرح جسم کی رگ رگ کو کاٹتی  
 تھیں۔

کھڑکیوں میں ایسے سوراب ہو گئے تھے جن سے بیک وقت  
 زرد روشنی اور ہوا کی سرسبز لہریں اندر آتی تھیں۔ ہر راہبہ کی اپنی  
 چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ جس میں سوکھی گھاس والے بستر کے علاوہ  
 کھروری لکڑی کی ایک ایک کرسی اور ایک ایک تپائی بھی تھی۔  
 تپائی پر مٹی کا کوزہ اور آب کوزہ رکھا رہتا تھا۔ کسی راہبہ کو دوسری  
 راہبہ کی کوٹھری میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تاہم عزت  
 مآب مادر پیرینا جب اور جس وقت چاہتیں۔ ہر کوٹھری میں چاکر  
 دیکھ سکتی تھیں کہ کسی راہبہ نے اپنے سر یا بازوؤں کو پر بند کرنے کا  
 گناہ کبیرہ تو نہیں کیا ہے۔ کانٹ میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں  
 تھی۔ یا تو کوئی نہ کوئی کام انجام دیا جاتا تھا یا عبادت کی جاتی  
 تھی۔ کام بنائی، سلائی، کڑھائی، جلد سازی اور دھاگا کاٹنے پر  
 مشغول تھا۔ روزانہ آٹھ اوقات کی عبادت لازمی تھی۔ ان کے  
 علاوہ حمد و ثنا، ذکر، وظیفے اور مراتب پر بھی کچھ نہ کچھ وقت صرف  
 کرنا پڑتا تھا۔ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ ساری راہباں اپنے  
 جسم کو سزا دیا کرتی تھیں۔ بارہ انچ لمبا کوڑا، جس میں چھ کانٹوں  
 والی موی رسی ہوتی، پیچھے پر، ناکوں پر اور گھٹوں پر اپنے ہاتھوں  
 ہی سے مارا جاتا تھا۔ جس کی چوٹ ناقابل برداشت ہوتی تھی۔  
 ان کا کہنا تھا کہ جس طرح کی تکالیف یسوع کے پاک اور مقدس  
 جسم کو پہنچانی گئیں، ان کے اتباع میں ویسی ہی تکالیف ہمارے  
 ناپاک اور گناہ گار جسم کو بھی پہنچانا چاہئیں۔

راہباؤں کی زندگی کا موزانہ قید خانوں سے کیا جاسکتا تھا۔  
 فرق اتنا تھا کہ قیدی باہر جانے کی آرزو کرتے تھے۔ جب کہ  
 راہباں خوش اور مطمئن تھیں۔ کانٹ اگر قید خانہ تھا تو ایسا قید  
 خانہ تھا جسے جنت الفردوس میں تعبیر کیا گیا تھا اور کوئی بھی راہبہ  
 جنت چھوڑ کر باہر کی دوزخ میں جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

.....☆☆☆.....

سسر لوشیا گھنٹیوں کی آواز پر جاگ اٹھی۔ اس نے آنکھیں  
 کھولیں، چھوٹی سی کوٹھری گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔  
 گھنٹیوں کی آواز سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ رات کے تین بج  
 چکے ہیں اور آدرا شب کی عبادت کا وقت شروع ہو گیا ہے۔  
 ”لعلت ہے ایسی عبادت پر“ سسر لوشیا نے بڑبڑا کر کہا۔  
 ”ساری دنیا گہری نیند کے مزے لے رہی ہے۔ اگر مجھے یہاں  
 کچھ دن اور رہنا پڑ گیا تو میں یقیناً مر جاؤں گی۔“

وہ پیٹ کے بل کھاس کے بستر پر لیٹ گئی۔ پیٹ کے بل لیٹنا  
 گناہ عظیم تھا۔ اس سے بھی عظیم تر گناہ یہ تھا کہ کسی دنیاوی شے  
 کی خواہش کی جائے۔ سسر لوشیا نہ صرف یہ کہ پیٹ کے بل لیٹی  
 تھی بلکہ سگریٹ پینے کی خواہش بھی کر رہی تھی۔ عرصہ دراز تک  
 سگریٹ نوشی کرنے کے بعد اسے اچانک اپنی عادت چھوڑنا  
 پڑ گئی تھی۔ اسی طرح لینے لینے اس نے اپنے جسم کے موٹے اور  
 بھدے لباس پر ہاتھ پھیرا اور وہ باریک اور نرم مٹی لباس اس کی  
 نظروں میں گھومتے لگے جو روم والے اس کے اپنے اپارٹمنٹ  
 میں گناڈا میں اس کے کمرے کی الماریوں میں لٹکے ہوئے تھے۔  
 کوٹھری سے باہر دوسری راہباؤں کے چلنے کی سرسراہٹ سنائی  
 دے رہی تھی جو بال میں عبادت کے لیے جا رہی تھیں۔ ایک لمبی  
 سی انگڑائی لینے کا گناہ کر کے سسر لوشیا اٹھی، کانٹ کے  
 معمولات کو گندہ سی گالی دی اور آنکھیں ملتے ہوئے کوٹھری  
 سے نکلی۔

”ساری کی ساری راہباں نیو یو فوٹ بیگنوں کے جھنڈ کی  
 طرح ہیں۔“ اس نے قطار میں سر جھکائے، خاموش اور مغمو  
 راہباؤں کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں یہ بات  
 نہیں آ سکی تھی کہ ان عورتوں کے جنس کو، خوبصورت ملبوسات کو  
 اور خوش ذائقہ کھانوں کو چھوڑ کر اپنی زندگی کو دیکھ کیوں لگائی  
 ہے؟

سسر لوشیا جب کانٹ میں داخل ہوئی تھی اور اس نے وہاں  
 رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو عزت مآب مادر پیرینا نے اسے  
 بتایا تھا۔ ”ہم ہمیشہ سر جھکا کر نظریں نیچی کر کے چلتا ہوا۔  
 اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے کو ڈھانپے رہو گی۔ چھوٹے قدم  
 اٹھاؤ گی۔ آہستہ آہستہ چلو گی، کسی دوسری سسر سے آنکھیں چار  
 نہیں کر دو گی، نہ کسی کی طرف کن کھیں سے دیکھو گی۔ کسی سے  
 بولنے کی کوشش بھی نہیں کر دو گی اور کانٹوں سے صرف خداوند خدا  
 کے احکامات سننے کا کام لو گی۔“

”ٹھیک ہے، عزت مآب ماں!“  
 چند روز بعد اس نئی ہدایات ملیں۔

اگائی جاسکتی تھی۔

سسر لوشیا کو مختصری کوٹھری سوچی گئی تھی، اس کا نام اس نے ”چوہے کا بل“ رکھا تھا۔ وہ پابندی سے خبریں پڑھنے اور سننے کی عادی تھی لیکن کاؤنٹ میں نہ ریڈیو تھا۔ نہ ٹی وی۔ کوئی اخبار بھی نہیں آتا تھا۔ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اسے سب سے زیادہ جس چیز نے پریشان کیا، وہ وہاں کا غیر فطری سکوت تھا۔ قسمت نے اسے ایک ایسی ہستی میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں کے مکین زبان اور آنکھیں رکھتے ہوئے بھی گونگے اور اندھے تھے۔ ہر طرف ایک بے کسی سی چھائی ہوئی تھی۔ راہبانیں عورتیں کم اور روپوٹ زیادہ معلوم ہوتی تھیں۔ جو معمول کے مطابق گرد و پیش سے بے خبر شب و روز اپنا کام انجام دیتی رہتی تھیں۔

ہال میں آٹھ مرتبہ عبادت ہوتی۔ راہبانیں خاموشی سے دعائیں پڑھتی رہتیں۔ اور یسوع کو اپنی نیک چلتی اور وفاداری کا یقین دلانی رہتیں۔ صرف سسر لوشیا ایسی تھی جو خداوند خدا سے زیادہ اہم باتوں کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ ”ایک یا دو ماہ میں، جب پولیس میری تلاش میں ناکام ہو کر مجھے بھول جائے گی تو میں امتحان کی اس ہستی سے کھٹک جاؤں گی اور نئے سرے سے حسین اور خوبصورت زندگی کی ابتدا کروں گی۔“

مذبح کی عبادت کے بعد سسر لوشیا دوسری راہبانوں کی معیت میں ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں جاتی۔ وہاں کے قانون کو توڑتے ہوئے ایک گناہ وہ بڑی پابندی سے کیا کرتی تھی ایک ایک راہبہ کو غور سے دیکھتی تھی۔ اس گناہ کو اس کی واحد تفریح کہا جاسکتا تھا۔ سسر لوشیا حیرت کرتی تھی کہ سسرز میں سے کسی کو یہ علم نہیں کہ باقی دوسری کس صورت شکل، رنگ روپ اور قد کاٹھ کی ہیں۔

سسرز میں کچھ بوڑھی تھیں، کچھ جوان۔ کچھ خوبصورت تھیں، کچھ بد صورت ان میں تین چہرے ایسے تھے جو خاص طور سسر لوشیا کی خصوصی دلچسپی کا باعث تھے۔ پہلا چہرہ سسرز یا کا تھا جو ساٹھ سال کی تھی۔ خوبصورتی اس کے قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ پھر بھی ایک عجیب سانور تھا جو ہر وقت کے اس کی چہرے پر چھایا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر اس تصور کے ساتھ مسکراتی رہتی ہو کہ اس کے پاس ایک ایسا خفیہ پیش بہا خزانہ ہے۔ جس سے سب بے خبر ہیں۔ دوسرا چہرہ سسر گرئس کا تھا جس کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال تھی۔ وہ غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے خوبصورت اور متناسب جسم کا خمیر خالص دودھ سے حاصل کیا گیا ہو۔ سمندر جیسی گہری

”سسر لوشیا“، عزت مآب مادر بیٹا نے کہا۔ ”جو عورتیں یہاں آتی ہیں، وہ دوسری عورتوں میں شامل ہونے کے لیے نہیں آئیں۔ وہ نہ تنہا خداوند خدا کے ساتھ رہتی ہیں۔ روح جتنی تنہا اور اداس ہوگی اتنی ہی خداوند خدا کے قریب ہوگی۔ قرب خداوندی کے لیے خاموشی سب سے زیادہ اہم ہے۔“

”ٹھیک ہے، عزت مآب ماں!“

”تمہیں اپنی آنکھوں کو بھی قابو میں کرنا پڑے گا۔ آنکھیں ایسے شیطانی تیر ہیں۔ جودل اور دماغ دونوں کو بری طرح مجروح کر دیتے ہیں۔ اپنی ہم جنسوں کو دیکھنا بھی گناہ ہے۔ خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونا بھی گناہ ہے۔ جس شے کو دیکھ کر خوشی کا احساس ہو، اس پر دوسری نظر ڈالنا بھی گناہ ہے۔“

”ٹھیک ہے، عزت مآب!“

”یہاں کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ اپنے ماضی کو بھلا دو۔“

بچپلی عادتوں کو چھوڑ دو۔ دنیاوی رشتوں کو فراموش کر دو۔ نفس کے کہنے پر نہ چلو۔ ظاہر و باطن کو پاک رکھو۔ اپنی ذات سے محبت نہ کرو۔ صرف اپنے گناہوں کی معافی مت مانگو، دنیا میں ہونے والے ہر گناہ کی معافی طلب کرو۔ چاہے وہ گناہ کسی نے بھی کیوں نہ کیا ہو اور یہ بھی یاد رکھو کہ دنیا کی سب سے کمین سب سے ذلیل اور سب سے حقیر ہستی تمہاری اور صرف تمہاری ہے اور دنیا میں جتنی بھی بلائیں وہائیں اور بیماریاں نازل ہوتی ہیں وہ محض تمہاری شامت اعمال کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، مقدس ماں۔“

”میری ہدایات پر عمل کرو گی تو یہ خانقاہ بھی تمہارے لیے جنت بن جائے گی، تمہارا باطن انوار سے جگمگا اٹھے گا اور تمہیں آسمانوں پر ہونے والی گفتگو سنائی دے گی۔“

”ٹھیک ہے، عزت مآب ماں۔“

ایک ماہ بعد لوشیا کو باقاعدہ عہد کرنا پڑا کہ وہ ساری زندگی مرد کے بغیر گزارے گی اور خود کو روحانی طور پر یسوع مسیح کی بیوی تصور کرے گی۔ اس روز سیرے ہی عزت مآب ماں نے لوشیا کو اپنے آفس میں طلب کیا اور اشارے سے ایک طرف بیٹھنے کے لیے کہا۔ لوشیا بیٹھ گئی تو عزت مآب ماں اس کی پشت پر گئیں اور اس سے پہلے کہ لوشیا کچھ سمجھتی، اس نے پچھی چلنے کی آواز سنیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے خوبصورت سنہرے بال اس کی گود میں آگرے۔ وہ غصے سے لال بھوکا ہو گئی۔ قریب تھا کہ عزت مآب ماں کا منہ نوج لیں، مگر شکر ہے کہ اسے فوراً ہی اصل بات یاد آگئی۔ وہ خود کو کاؤنٹ میں چھپانے کے لیے آئی تھی۔ بالوں کا کیا تھا۔ گھر کی کھیتی تھی۔ کاؤنٹ سے نکل کر دوبارہ

آنکھیں تھیں جو کانٹ کے باہر قیامت برپا کر سکتی تھیں لیکن ضائع ہو رہی تھیں۔ سسر لوشیا قسم کھا سکتی تھی کہ ایسی قاتل آنکھیں شاد و نادر ہی ہوتی ہیں۔ گریس کو تو فہم انسا رہنا چاہیے تھا۔ نہ جانے ایسی کون سی مجبوری تھی جو اسے بے حس اور نادبی رہا ہاؤں میں لے آئی تھی۔

تیسری سسر میگن تھی جو سسر لوشیا کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث تھی۔ ابھی وہ بیس سال کی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں، کشادہ پیشانی، پھولے پھولے رخسار، ایک عجیب سی شوخی جسے زبردستی متانت کے ذریعے ڈھانپا گیا تھا۔ کانٹ کے بھدے اور بصورت لباس میں لپٹے ہونے کے باوجود میگن کو جس طرف سے بھی دیکھا جاتا۔ حسین معلوم ہوتی تھی۔

لوشیا سوچتی اور بار بار سوچتی کہ میگن جیسی نوجوان اور کم عمر لڑکی وہاں کیوں آئی تھی؟ گریس جیسی حسینہ عالم وہاں اپنے حسن و جمال کو کیوں غارت کر رہی تھی؟ دوسری راہبائیں وہاں کیوں اکٹھا ہوئی تھیں؟ کم کھانے اور کم سونے کو انہوں نے اپنا دتیرہ بنا رکھا تھا؟ انہیں اندھی، گولی اور بہری بن کر زندگی گزارنے میں کیا لطف آ رہا تھا؟ لوگ کانٹ کو کتنے ہی خوبصورت ناموں سے کیوں نہ یاد کرتے ہوں، سسر لوشیا کے نزدیک وہ ایک ایسا مردہ خانہ تھا جس میں بھانت بھانت کی زندہ لائیں جمع کر دی گئی تھیں۔

دوسری سسر کے مقابلے میں سسر لوشیا جذبات بھی رکھتی تھی اور حس بھی۔ عبادت کے دوران اسے فلمی گیت یاد آتے تھے اور جب وہ اپنے چوہے کے بل میں سوکھی گھاس کے بستر پر لیٹی تھی۔ تو یسوع مسیح کے بجائے اس کے تصور میں نوجوان لڑکے گھوما کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ دیگر سسر کو وہاں ہمیشہ رہنا تھا جب کہ سسر لوشیا صرف ایک اور زیادہ سے زیادہ دو مہینے کی مہمان تھی۔ باہر کی دنیا جہاں سن تھا موسیقی تھی ہلکے تھے، گناہ تھے۔ اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے۔“ وہ سوچتی تھی۔ ”مجھے یہاں تین ماہ تک رہنا پڑا ہے۔ غلٹ اور جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ پولیس اور قانون کی نظر سے محفوظ رہنے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد جب وہ لوگ میری طرف سے مایوس ہو جائیں گے تب میں یہاں سے نکلوں گی۔ سوئزرلینڈ کے پنک سے اپنی رقم نکلاؤں گی اور تفریق کے بعد اگر کچھ وقت ملا تو اس پاگل خانے کے بارے میں کتاب تحریر کروں گی اور دنیا کو بتاؤں گی کہ مذہب کے ٹھیکے داروں نے

عورتوں کو کس طرح زندہ درگور کر کے ان سے جنس کی تفریق کی، موسیقی کی اور سکون و عافیت کی نعمتیں چھین لی ہیں۔ بھلا یسوع مسیح اتنی بیویوں کا کیا کریں گے؟

ایک رات جب وہ پیٹ کے بل لیٹنے کا گناہ کرتے ہوئے سگرٹ پیٹنے کے ناپاک خیال سے اپنے ذہن کو گندہ کرنے میں مصروف تھی۔ تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر کرنل ریمن اکو کا اور گونے تنظیم کے احتیاط سے منتخب کردہ دو درجن افراد، رات کی گہری تاریکی اور خاموشی میں اچانک کانٹ پر ٹوٹ پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

☆☆☆☆☆.....

سسر میگن گہری نیند سے اچانک بیدار ہو گئی۔ کانٹ میں حسب معمول خاموشی طاری تھی۔ لیکن خاموشی میں کچھ کچھ اکٹھا پن تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خاموشی حرکت کر رہی ہو۔ کانٹ میں اپنے قیام کے پچھلے پندرہ سال میں اس نے بھی ایسی متحرک خاموشی کا احساس نہیں کیا تھا۔ کوئی نہ کوئی نئی اور انوکھی بات ضرور تھی۔

وہ گھاس کے بستر سے اٹھی اور کوٹھری کا دروازہ کھول کر باہر چھاٹکا۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ کچھ کچھ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ سر پہ چھری کی راہداری آدمیوں سے پر تھی۔ پھر اس نے ایک دیو قامت شخص کو جس کے چہرے پر گہرے زخم کا نشان تھا۔ عزت مآب ماں کی کوٹھری سے باہر نکلے دیکھا۔ وہ انہیں بازو۔ کڑکر کھینچتا ہوا باہر لے کر آ رہا تھا۔

”میں پوچھتا ہوں تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟“ عزت مآب ماں ڈری اور سہمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہہ رہی تھیں۔ ”خش خش یہ خدا کا گھر ہے۔ تم اس کے احترام کو مجروح کر رہے ہو۔ توبہ کرو اور اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

”سسر! دیو قامت انسان نے عزت مآب مادر بیٹینا کے بازو کو مروڑ کر کہا۔ ”مجھے بھی مایہ کی ضرورت ہے۔“ نہیں، سسر میگن نے سوچا، وہ کوئی ڈراؤنا خواب نہیں تھا۔ ڈراؤنی حقیقت تھی۔

دوسری کوٹھریوں کے دروازے بھی کھلنے لگے اور گھبرائے ہوئے چہروں والی راہبائیں باہر آنے لگیں۔ انہوں نے اس افتاد کے بارے میں بھی سوچا کتنا نہیں تھا۔ دیو قامت شخص نے جو دراصل کرنل اکو کا تھا۔ عزت مآب ماں کو زور سے ایک جانب دھکا دیا اور اپنے قریب کھڑے شخص

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوپر سے نیچے تک پوری عمارت کی خوب اچھی طرح تلاشی لو۔ کوئی جگہ باقی نہ بچنے پائے۔“

اکو کا کے آدمی عمارت میں پھیل گئے۔ انہوں نے ہال کی عبادت گاہ میں توڑ پھوڑ کی، چکن کی چیزوں کو اٹھا کر ادھر ادھر پھینک دیا۔ کھڑکیوں میں مٹھس گئے اور جو رہائشی مخموخاب تھیں، انہیں ٹھوکریں مار کر ڈگایا اور کھڑکیوں سے باہر نکل کر ہال میں اکٹھا ہونے پر مجبور کیا۔ سسٹر ز اس عالم میں بھی اپنے عہد پر قائم رہیں اور زبان سے کوئی لفظ ادا کے بغیر احکامات کی بجا آوری کرتی رہیں۔ سارا منظر ایک ایسی فلم جیسا تھا جو متحرک تو ہو لیکن اس کی آواز بند کر دی گئی ہو۔

اکو کا کارگزاری کا جائزہ لیتے ہوئے راہداری سے گزر رہا تھا کہ ایک کھڑی سے اسے نوائی چیخ سنائی دی۔ وہ پلٹا اور کھڑی کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اس کا ایک آدمی کھڑی کی راہبہ پر حملہ آور تھا۔ اس کے ارادے نیک نہیں تھے۔ مگر اکو کا نے رکنا اور ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ فوراً آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆.....

سسٹر لوشیا چند لمحوں قبل ہی سوئی تھی۔ لوگوں کی گالیاں سن کر بوکھلا کر اٹھی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ پولیس نے میرا ہتھ پلا لیا ہے۔ مثنی جلدی ہو سکے۔ مجھے یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ لیکن سامنے والے گیٹ کے علاوہ کانوٹ سے باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

وہ تیزی سے کھڑی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی اور جھانک کر راہداری میں دیکھا۔ راہداری پولیس والوں سے نہیں بلکہ سادہ لباس والے ایسے افراد سے بھری ہوئی تھی جن کے پاس آتشیں ہتھیار تھے اور وہ سامنے آنے والی ہر میز، ہر کرسی اور ہر ایپ گنڈی گندی گالیاں بکتے ہوئے توڑ رہے تھے۔

عزت مآب مادر بیٹینا اس طوفان بدتمیزی میں ایک طرف بالکل خاموش کھڑی تھیں۔ ان کے ہونٹ دعا سے انداز میں آہستہ آہستہ مل رہے تھے اور آنسوؤں سے بھری آنکھیں خدا کے گھر کو بے دردی سے اڑتے دیکھ رہی تھیں۔ لوشیا نے سسٹر میگن کو کھڑی سے نکل کر عزت مآب ماں کی طرف جاتے دیکھا تو وہ بھی اپنی کھڑی سے نکلی اور ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

”یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے مقدس ماں!“ اس نے پوچھا۔ کانوٹ میں آنے کے بعد پہلی بار اس نے تیز آواز میں بات کی تھی۔ ”یہ لوگ کون ہیں اور یہاں کیا کرتے پھر رہے ہیں؟“ عزت مآب ماں نے ان دونوں کو اشارہ کیا کہ وہ کہیں چھپ جائیں۔

”یہ اشاروں اور کنایوں کا وقت نہیں ہے۔“ لوشیا نے کانوٹ کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔ ”اس وقت آپ بول سکتی ہیں آئیے ہم سب یہاں سے کہیں اور بھاگ جائیں۔ خدا کے لیے مقدس ماں میری بات مان لیجیے۔ آپ کو یسوع مسیح کا واسطہ۔“

اکو کا کے نائب نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ”کرٹل، ہم نے پوری عمارت کے پچے پچے کو چھان ڈالا ہے۔ یہاں نہ جی مائیرو ہے، نہ اس کا کوئی آدمی!“

”دوبارہ تلاشی لو۔“

یہ وہ وقت تھا جب عزت مآب مادر بیٹینا کو کانوٹ کا واحد پیش بہا خزانہ یاد آ گیا۔ وہ تیزی سے سسٹر ٹریسا کے پاس گئیں اور سرگوشی میں کہا۔ ”میں تمہیں ایک اہم کام سونپتی ہوں۔ ری فکٹری کی کیمپٹ سے سونے کی صلیب نکالو اور جس طرح بھی بن پڑے اسے مینڈیویا کی کانوٹ میں پہنچا دو۔ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔“

بوڑھی سسٹر ٹریسا اس طرح کا پنے لگی جیسے اسے سردی چڑھ گئی ہو۔ اس نے بے بسی سے عزت مآب ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے زندگی کے تیس سال کانوٹ کی نذر کر دیے تھے اور اب جب کہ وہ قبر کے دہانے تک پہنچ چکی تھی، کانوٹ کو چھوڑنے کا تصور اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کچکا تا ہوا ہاتھ اور اٹھا کر اس نے بڑی بے چارگی سے اشارہ کیا۔ ”یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔“

عزت مآب ماں کا لہجہ خوشامدانہ ہو گیا۔ ”اگر صلیب کو منتقل نہیں کیا گیا تو وہ شیطان کے ان چیلوں کے ہاتھ لگ جائے گی۔ میری خاطر نہیں! اپنے یسوع کی خاطر اس کام کو انجام دے ڈالو۔“

محبوب کا پیرا نام سن کر سسٹر ٹریسا کی آنکھیں چمک اٹھیں چہرے سے خوف کے آثار دور ہو گئے۔ اس نے اشارے سے کہا۔ ”محبوب کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“ اور اس اشارے کے ساتھ ہی وہ ری فکٹری کی کیمپٹ کی سمت روانہ ہو گئی۔

کانوٹ کی تلاش لینے والے لوگ اور زیادہ پھر گئے تھے اور نظر آنے والی ہر چیز کو توڑ رہے تھے۔ کرٹل اکو کا تعریفی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

لوشیا نے موقع غنیمت دیکھ کر اپنے پاس کھڑی میگن اور گرلیس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم دونوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہتی کہ کیا سوچ رہی ہو لیکن میں اس دوزخ سے باہر جارتی

ہوں۔ چاہو تو تم بھی میرے ساتھ چل سکتی ہو۔“  
میگن اور گرلیں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ میں کیا کرنا چاہیے؟

سسر ٹریا اس اثنا میں کپڑے میں لپٹی ہوئی سونے کی صلیب بغل میں دبا کر ادھر آئی اور رکے بغیر گیٹ کی طرف بڑھنے لگی

”سسر ٹریا بھی کھسک رہی ہیں۔“ لوشیا نے میگن اور گرلیں سے کہا۔ ”آؤ۔ ان کے پیچھے ہم بھی نکل چلیں۔ خود کو بد معاشوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔“  
آگے آگے سسر ٹریا اور اس کے عقب میں یہ تینوں سسرز گیٹ تک پہنچ گئیں۔

بھاری بھر کم بوٹوں والا ایک آدمی اچانک ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور قہقہہ لگا کر بولا۔ ”یہاں سے بھاگی جا رہی ہو؟ چلو۔ اندر جاؤ۔ میرے دوست بڑے حسین خواب دیکھ کر یہاں آئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہیں گے۔“

لوشیا آگے بڑھی اور اٹھلا کر بولی۔ ”ہمارے پاس تمہارے لیے ایک تختہ ہے۔“

اس نے گیٹ پر لگا ہوا موم بتی کا فولادی اسٹینڈ نکال لیا اور مسکراتے لگی۔ ”یہ کیا ہے؟“

لوشیا نے ہنس کر پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ ”یہ ہے۔“

وہ آدمی ایک ہی وار میں ڈھیر ہو گیا۔ لوشیا نے اطمینان سے فولادی اسٹینڈ کو اس کے بے ہوش جسم کے پاس رکھ دیا۔ تینوں راہبانیں حیرت اور خوف سے لوشیا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”آؤ۔ اس نے کہا۔“

چند لمحوں بعد چاروں سسرز کا نوٹ کے عقب میں پہنچ گئیں۔

لوشیا نے اچانک رک کر کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔ تمہارے جہاں سیگ سائیں، ادھر بھاگ جاؤ۔ وہ لوگ بہت جلد تمہاری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔“

سسرز پر الوادی نظر ڈال کر اس دور نظر آنے والی پہاڑیوں کی جانب قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ ”میں پہاڑیوں میں نہیں نہ کہیں چھپ جاؤں گی اور جب پولیس میری طرف سے ناامید ہو جائے گی تو وہاں سے نکل کر سوئٹزر لینڈ چلی جاؤں گی۔ لعنت ہو ان بد معاشوں پر جنہوں نے کا نوٹ میں کھس کر میری بہترین پناہ گاہ کو ختم کر دیا۔“

تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد لوشیا نے گھوم کر سسرز کی

طرف دیکھا۔ تینوں مبہوت سی وہیں کھڑی تھیں، جہاں وہ انہیں چھوڑ کر آئی تھی۔

”خدا ارادہاں سے ہٹ کر کہیں چھپ جاؤ۔“ لوشیا نے دل ہی دل میں ان سے کہا۔ ”یہیں کھڑی رہو گی تو بد معاش تمہیں ڈھونڈھ نکالیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ تم تک پہنچیں، کہیں نہ کہیں چلی جاؤ۔ جلدی کرو۔“

مگر تینوں اسی طرح کھڑی رہیں۔ لوگ لگ رہا تھا جیسے ان کے احساسات پر فاج گر گیا ہو اور وہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ جنہیں خدا کے گھر میں پناہ نہیں مل سکی۔ انہیں کسی دوسری جگہ کس طرح پناہ مل سکتی تھی۔ کیا خدا ان سے ناراض ہو گیا تھا؟ وہ انہیں کسی قسم کی سزا دینا چاہتا تھا؟ آخراں کا منصوبہ کیا تھا؟

تینوں قریب قریب کھڑی تھیں۔ لیکن بولتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر رہی تھیں۔ کا نوٹ سے باہر بھی وہ کا نوٹ کے اصولوں پر عمل پیرا تھیں۔

کئی منٹ کی بچکاچٹ کے بعد سسر ٹریا نے اوپلا کے گھروں کی روشنیوں کی طرف دیکھا اور اشارے سے کہا۔ ”آؤ، ادھر چلیں۔“ اور تھپی طرف قدم اٹھانا شروع کر دیے۔

”ادھر نہیں۔ اچھی۔“ لوشیا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑا کر کہا۔ ”میری آواز تم تک نہیں پہنچ سکتی۔ کاش، میں تمہیں بتا سکتی کہ سب سے پہلے بد معاش تمہیں وہیں تلاش کریں گے۔ خیر یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میں تو بہر حال محفوظ ہوں۔“

وہ انہیں موت کے منہ میں جاتے دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں ان پر لعنت بھیجتی رہی، پھر اچانک تیزی سے اتری اور بھاگتی، ہاپتی اور بچتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔

”رک جاؤ۔ رک جاؤ۔“

سسرز رگ ٹھکیں اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

لوشیا نے پابنیتے ہوئے کہا۔ ”غلط راستے پر جا رہی ہو۔ سب سے پہلے تمہیں آبادی ہی میں تلاش کیا جائے گا۔ کسی نے تلاش نہیں کیا۔ تب بھی وہاں کے باشندے تمہیں پکڑ کر ان کے حوالے کر دیں گے۔ تمہیں چھپانے کا خطرہ کوئی مول نہیں لے گا۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکی، پھر اسی لہجے میں بولی۔ ”چھپنے کے لیے کوئی دوسری محفوظ جگہ تلاش کرو۔“

تینوں خاموشی سے اس کے چہرے کو کتنے لگیں۔

”پہاڑیوں پر چلو۔“ لوشیا نے مشورہ دیا۔ ”آؤ، میرے پیچھے چلو۔ اس وقت پر پچھ پھاڑیاں ہی ہمیں پناہ دے سکتی ہیں۔“

وہ مڑی اور دوبارہ پہاڑیوں کی سمت چل دی۔ سسرز نے

”ہمارے پہنچنے سے چند منٹ قبل جیمی مائیکرو کا نوٹ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔“

”مجھے علم ہے۔“ وزیر اعظم رائیڈز نے خشک لہجے میں کہا۔ جب سے کرنل اکو کا کوچی مایر کو پکڑنے کا فرض سونپا گیا تھا، وہ حکومت کے کنٹرول سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ کانٹن پر جو وحشیانہ حملہ کیا گیا تھا، اس رپورٹ سے اسپین میں احتجاج کیا جا رہا تھا۔ ”جو کچھ ہوا؟“ وزیر اعظم نے بے تعلق الفاظ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اخبارات ہی ہیں جنہوں نے جیمی مایر ایسے غدار اور قاتل کو ملک کا ہیرو بنا ڈالا ہے۔“ کرنل اکو کا جواب دیا۔ ”انہیں لگام لگانا ضروری ہے ورنہ“

”اخبارات کا منہ بند نہیں کیا جاسکتا۔“ وزیراعظم نے کہا۔  
 ”بہتہ ان کی اشاعت کچھ عرصے کے لیے معطل کی جاسکتی ہے  
 مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب تک جیٹو مایہ و ہمارے لیے  
 مصیبت کا باعث بنا ہوا تھا مگر اب چارراہیوں کا اور اضافہ ہو گیا  
 ہے۔ اگر ان کی زبان کھل گئی تو ہم دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے  
 قابل نہیں رہیں گے۔“

’پروانہ کریں۔ وہ کہیں دور نہیں جاسکتیں۔ میں بہت جلدی نہیں گرفتار کرلوں گا اور مایہ کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کروں گا۔‘

مگر وزیر اعظم پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ کرنل اکو کا کو زیادہ  
بھیل نہیں دی جاسکتی۔

”کرنل!“ اس نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ چالیس میں سے چوتھیں راہبائیں تمہارے قبضے میں ہیں۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ میں نے فوج کے لیے احکامات جاری کر دیے ہیں کہ جینی میاں رو اور اس کے ساتھیوں کی تلاش میں اپنا کردار ادا کرنے اب تم کرنل کا مشیو کے ساتھ کام کرو گے۔“

طویل اور خوفناک وقفہ، جس میں اکوکانے اس طرح گہری سانس لی جیسے سانپ پھنکار رہا ہو، پھر اس نے وزیر اعظم کی کھنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔

”اس آریشن کا انصارج کون ہوگا؟“

وزیر اعظم کو فوری طور پر اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر بولا۔ ”تمہارے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟“

.....☆☆☆.....

لوشیا اور تینوں سسرز کا سفر طلوع آفتاب تک شمال مشرق کی سمت جاری رہا۔ راہبائیں خاموشی کی عادی تھیں، کچھ کہے سنے بغیر چلتی رہیں۔ لقمہ و دق پہاڑیوں پر یا تو ان کے کپڑوں کی

سربراہ سناٹی دے رہی تھی یا تسبیحوں کے دانوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی چھاڑی کی ٹہنیوں کو چھانے یا کسی سسڑ کے ہانسنے کی آواز بھی سناٹی دے جاتی۔ پہاڑیوں پر چڑھنا آسان نہیں تھا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ طلوع آفتاب سے قبل جب ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہوئی، وہ کئی میل کا سفر طے کر کے ولاکاشن نامی دیہات کے نواح میں پہنچ چکی تھیں۔

”میں انہیں یہیں چھوڑ دوں گی۔“ لوشیانے دل ہی دل میں سوچا۔ ”اب ان کا خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ مجھے سوسٹرز لینڈ جانا ہے اور غضب تو یہ ہے کہ نہ میرے پاس رقم ہے اور نہ پاسپورٹ لہاس بھی ایسا ہے جیسے سیدی قبر سے نکل کر پھلی آئی ہوں۔ اب تک ان بد معاشوں کو ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہوگا اور وہ شکاری کتوں کی طرح ہماری بوسوگتھے پھر رہے ہوں گے۔ جتنی جلدی ان بے ہودہ سسڑز سے چھٹکارا پاؤں، میرے حق میں اتنا ہی بہتر ہے۔“

لیکن اسی لمحے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے سے روک دیا۔

سسڑز یا چھاڑیوں کے قریب سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک چھوٹی سی نوک دار چٹان سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئی اور اس کی بغل میں دہلی کپڑے سے لپٹی چیز نیچے گر گئی۔ گرنے کے باعث اس چیز کا کپڑا تھوڑا سا سرک گیا۔ لوشیا جو سسڑز یا چھاڑی کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے دم بخود ہو کر رہ گئی۔ اس کی نظریں اس چیز پر جم گئیں اور اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ سسڑز یا چھاڑی کی چیز کی اپنی جان سے بھی زیادہ حفاظت کر رہی تھی۔ وہ ٹھوس سونے کی صلیب تھی۔

”اوپر والا میری مدد کر رہا ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”ٹھوس سونے کی یہ صلیب اس نے میری خاطر یہاں بھیجی ہے۔ یہ صلیب نہیں، میرا سوسٹرز لینڈ کا ٹکٹ ہے۔“

وہ سسڑز یا چھاڑی کو صلیب اٹھا کر کپڑے میں لپیٹتی اور دوبارہ بغل میں رکھتے ہوئے دھنستی رہی اور مسکراتی رہی۔ بوڑھی سسڑز سے اسے ہتھیانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ راہبائیں اس کے اشاروں پر ناچ رہی تھیں، وہ جو کچھ بھی کہتی تھی۔ اس پر اس طرح عمل کرتی تھیں جیسے براہ راست آسمان سے ہدایات موصول ہو رہی ہوں۔

☆☆☆☆.....

صبح کی روشنی رات کی تاریکی سے زیادہ خوفناک معلوم ہو رہی

تھی۔ خداوند خدا نے سسڑز کو جنت الفردوس سے نکال کر ایک بالکل نئی اور بے حد رواؤنی دنیا میں بھیج دیا تھا۔ چلتے چلتے وہ اس حد تک تھک چکی تھیں کہ تسبیحوں کے دانے تک پھیرنا دوبھر ہو گیا تھا۔ کانوٹ سے نکلنے کے بعد انہوں نے وہاں کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے پرہیز کیا تھا۔ لیکن اب اتنا اتقویٰ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا گناہ کر رہی تھیں اور جس طرح ایک گناہ دوسرے گناہ کی طرف اکساتا ہے اسی طرح ان کی خواہش بھی کہ بولنے کا بھی گناہ کیا جائے مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ان میں صرف لوشیا یا ایسی کئی جو بڑی بے حیائی کے پے درپے لگتا ہوں کی مرتکب ہو رہی تھی اور اس کے کچھ میں تاسف کے بجائے اتنا خود اعتمادی تھی کہ دوسری سسڑز نے از خود اسے اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔

ایک بڑے درخت کے تنے کے پاس بیٹھ کر لوشیا نے کہا۔ ”پارسائی ہر وقت اور ہر جگہ نہیں چلتی اور زبان کو صرف ذکر الہی تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ بہتر ہے کہ اب ہم آپس میں ایک دوسرے سے اپنا تعارف کروائیں۔ میں سسڑ لوشیا ہوں۔“

چند ساعتوں کے لیے وہاں سنا سنا سنا چھا گیا۔ یوں گلنے لگا کہ سسڑز نے زبان کھولی تو آسمان ان کے سروں پر آگرے کا مگر سسڑ لوشیا تو سچی بھلی تھی۔ کانوٹ سے نکل کر اب تک وہ بے ٹکان بولتی رہی تھی پھر بھی اس کا بال تک بکا نہیں ہوا تھا۔

بالآخر گرگرس نے ہمت کی اور شرمیلی آواز میں بولی۔ ”میں سسڑ گرگرس ہوں۔“

”تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں فلم اٹار ہونا چاہیے تھا۔“ لوشیا نے سوچا۔ ”راہبوں میں کیوں آگئیں؟“

”میں سسڑ میکین ہوں۔“

”خوبصورت سنہرے بالوں اور پرکشش آنکھوں والی نوخیز حسینہ۔“ لوشیا نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔ ”تم اپنی دلکش اور دل فریب اداؤں سے لاکھوں نوجوانوں کو قتل کر سکتی ہو۔ کانوٹ کے بجائے تمہیں اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں رہنا چاہیے۔“

”میں سسڑز یا ہوں۔“

”بوڑھی عورت!“ لوشیا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”تمہیں تو شاید یہ بھی یاد نہیں رہا ہوگا کہ جوانی تھی دیوانی ہوئی ہے اور جذبات و احساسات کسے کہتے ہیں۔“

تعارف کے بعد ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ لوشیا نے یکے بعد دیگرے انگوٹھی لینے اور پیٹ کے بل لیٹنے کے کئی گناہ



کیے اور سوچنے لگی کہ یہ سسٹرز چڑیوں کے ان نوزائیدہ بچوں کی طرح ہیں، جو گھنسلوں سے نیچے گر گئے ہوں۔ ان میں اتنی بھی سکت نہیں ہے کہ کسی دوسرے کے ہمارے کے بغیر محض اپنے بل بوتے پر پانچ منٹ گزار سکیں۔ مگر میں کون ہوتی ہوں ان کی بے بسی پر کڑھنے والی میری بلا سے مریم یا جنیں، مجھے تو سونے کی صلیب حاصل کرنا ہے۔ تاکہ سوئزر لینڈ جاسکوں۔

سوئزر لینڈ کے خیال سے اسے بے چین کر دیا۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں نیچے دیہات میں جا کر کھانے بیٹے کا بندوبست کرتی ہوں، یہیں بیٹھ کر میری آمد کا انتظار کرو اور سسٹر تم۔“ اس نے فریاد کیا۔ ”تم میرے ساتھ چلو۔“

سسٹر یسا گھبرا گئی۔ پچھلے تیس چالیس سال سے وہ کسی بستی میں نہیں گئی تھی، یہی نہیں بلکہ پچھلے تیس چالیس سال سے وہ صرف عزت مآب مادر بیٹینا کے احکامات پر عمل کرتی آئی تھی اور اب اچانک یہ لڑکی اس کی انچارج بن بھی گئی۔

”شاید خداوند خدا کی بھی یہی مرضی ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”شاید خداوند خدا ہی نے اس لڑکی کو ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے اور وہ اس کی زبان سے احکامات جاری کر رہا ہے۔“

”سسٹر لوشیا!“ اس نے کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ صلیب ک و مینڈ بویا کی کانوٹ میں پہنچا دوں۔“ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ صلیب ان ہاتھوں میں پہنچ جائے جو اس کے سخت ہیں۔“ لوشیا معنی خیر انداز میں بولی۔ ”دیہات میں جانے کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ مینڈ بویا کی کانوٹ کا پتہ دریافت کیا جائے۔“

دونوں آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اترنے لگیں۔ لوشیا دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ اس کمزور اور بوڑھی عورت سے صلیب چھیننا پائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک ویران گلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آؤ اُدھر سے چلیں۔ زیادہ لوگوں کی نظروں میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔“

سسٹر یسا اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اس کے پیچھے چل دی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ لوشیا صلیب کو کس طرح حاصل کرے۔ ”میں صلیب کو چھین کر بھاگ سکتی ہوں مگر یسا اپنی چیخ پکار سے پورے دیہات کو اکٹھا کر لے گی۔“ اس نے سوچا۔ ”سب سے پہلے کوئی ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ سسٹر یسا چھپنے چلانے کے قابل نہ رہے۔“

گلی کے ایک کنارے پر کسی بچے کا ٹوٹا ہوا بلا پڑا تھا۔ لوشیا نے اسے دیکھا تو شبی امداد پر عمل آگئی۔ جا کر بلے کو اٹھایا۔ ادھر اتر کر پکھا۔ ”یقین ہو گیا کہ اسے سسٹر یسا کا سر پھاڑنے

کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے تو ایک عزم کے ساتھ آگے بڑھی۔

سسٹر یسا سارے عمل کو حیرت سے دیکھتی رہی تھی لیکن یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ بلا کیوں اٹھایا گیا ہے اور سسٹر لوشیا مسکراتے ہوئے اس کی طرف کیوں بڑھ رہی ہے۔

”سسٹر یسا!“ لوشیا نے اس کے قریب پہنچ کر کہا اور بلا اٹھایا کہ اس کے سر پر دے مارے مگر اچانک ایک طرف سے مردانہ آواز آئی۔

”خدا تم پر رحم کرے سسٹر۔ یہاں کیا کرتے پھر رہی ہو؟“

لوشیا لٹو کی طرح تیزی سے گھوم گئی۔ ساتنے ملگے چھوڑے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک طویل قامت و بلا پٹلا شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی حرارت سے بھری چمک تھی اور آواز خلوص اور محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”مجھے کاریلو کہتے ہیں۔ مائیکل کاریلو۔“ اس نے سسٹر سے اپنا تعارف کرایا۔

لوشیا کا دماغ انتہائی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ کاریلو کی مداخلت کے باعث اس کا سسٹر یسا کا سر پھاڑنے والا منصوبہ ناممکن رہ گیا تھا لیکن اب وہ دوسرے منصوبے پر عمل کر سکتی تھی۔ دوسرا منصوبہ پہلے منصوبے سے زیادہ بہتر تھا۔ اسپین سے باہر نکلنے کے لیے کاریلو کی مدد حاصل کی جاسکتی تھی۔

”شکر ہے خداوند خدا کا جو تار پٹی کا سینہ پھاڑ کر روشنی پیدا کرتا ہے اور پریشان حال اور تباہ حال مصلحتی ہوئی راہبائوں کی مدد اور رہنمائی کے لیے اپنے ایک نیک بندے کو بھیجتا ہے۔“ لوشیا نے اس طرح کہا جیسے وہ بائبل کی تلاوت کر رہی ہو۔ ”ہم اوپلا کی کانوٹ کی بد نصیب راہبائیں ہیں۔ گزشتہ شب کچھ بد معاشوں نے حملہ کر کے اسے تباہ کر ڈالا اور ساری راہبائوں کو خدا جانے کہاں پکڑ کر لے گئے۔ جب کہ ہم چار راہبائیں، سر کوٹھیل پر رکھ کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئیں۔“

”میں سان گریو کے چرچ کا ادا خدام ہوں، جہاں پچھلے تیس سال سے ملا موضع خدمات انجام دے رہا ہوں۔ پرسوں رات ہمارے چرچ پر بھی بد معاشوں نے چڑھائی کی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔“ کاریلو نے آدھ کر جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ خدا اپنے بندوں سے بے پناہ پیار کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت جس قسم کا پیار کر رہا ہے، وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”بد معاش ہماری تلاش میں ہیں۔“ لوشیا نے اپنی راگنی چھیڑی۔ ”تم مرد ہو، ان کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ ان سے بچنے کے

”اگلے دن جب جیمی اور بانڈا انیب ڈیزرٹ سے واپس ہوئے تو ان کے قبضے میں پانچ لاکھ پاؤنڈ کی مالیت کے ہیرے تھے۔ انہوں نے وان مرف کو دیوالیہ کر دیا تھا۔ اتنے کم عرصے میں یہ ان کی ایک غیر معمولی کامیابی تھی۔“

”اس میں سے آدھے ہیرے تمہارے ہیں۔“ جیمی نے بانڈا سے کہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ بانڈا نے جواب دیا۔ ”اس ملک میں آ کر کوئی سیہ فام اتنا مال دار ہو جائے تو پھر وہ زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔“

”لیکن یہ تمہارا حق ہے۔“ جیمی نے کہا۔ ”ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔“

”مجھے صرف اتنی رقم چاہیے کہ میں ایک فارم خرید سکوں اور شاوی کر سکوں۔“ بانڈا نے کہا۔ ”جب میں ایک فارم خرید لوں گا تو آرام سے زندگی گزار سکوں گا۔ پھر مجھے کسی ملازمت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں آزادانہ طور پر جی سکوں گا۔“

”ان میں سے جتنے ہیرے تمہارا جی چاہے لے لو۔“ جیمی نے کہا۔

بانڈا نے ان میں سے صرف تین ہیرے لیے اور جیمی سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ جیمی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ جلد ہی اس سے دوبارہ ملاقات کرے گا۔

اس واقعے کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا.....

کلپ ڈرنٹ کی بڑی بڑک پر ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ ایک شاندار وارے بے حد قیمتی گھوڑا گاڑی جسے دو خوب صورت گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اس میں ایک مضبوط جسم کا نوجوان آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے بال بالکل سفید تھے کسی ڈائریکٹر موچیں بھی سفید تھیں۔ وہ بالکل جدید طرز کے خوب صورت لباس میں بیٹھا تھا۔

جیمی میک گرینڈ کے جانے کے بعد سے گزشتہ ایک سال کے دوران کلپ ڈرنٹ میں بڑی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ اب یہ ایک اچھا خاصہ شہر بن گیا تھا۔ اس کا رابطہ ریلوے لائن سے بھی قائم ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے یہ آئے والوں کی تعداد میں ایک دم بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ پر ہر قسم کے لوگ نظر آ رہے تھے۔

جیمی کو تین دنوں اس ہال اور تقریباً پچھنے بٹل نظر آئے ایک نیا چرچ اور ایک نئی بار برشاپ بھی تعمیر ہو چکے تھے۔ اور گرینڈ کے نام سے یہ بہت بڑا ہوٹل بن چکا تھا۔ جیمی نے

اپنی گاڑی ایک بینک کے سامنے روکی اور اس میں سے اتر پڑا۔ جیمی بینک کے اندر داخل ہو کر سیدھا میجر کی نشست کی طرف بڑھا۔ اور بلند آواز میں بولا۔ ”میں تمہارے بینک میں ایک لاکھ پاؤنڈ جمع کرنا چاہتا ہوں۔“

جیسا کہ جیمی کو یقین تھا اس واقعے کی خبر جلد ہی سارے شہر میں پھیل گئی۔ اور جب وہ بینک سے نکل کر سن ڈاؤنر بسٹوران میں آیا تو وہ لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ اسٹیب بھی اس ریسٹوران میں موجود تھا۔ وہ دوڑا ہوا جیمی کے پاس آیا۔ اس کی آنکھوں میں پہچان کی کوئی جھلک موجود نہیں تھی کیونکہ جیمی یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ جیمی نے اطمینان کی سانس لی۔

”کیا لاؤں؟“ اسٹیب نے پوچھا۔

”جو تمہارے پاس بہترین چیز ہو۔“ جیمی نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”بہتر۔“ اسٹیب نے کہا۔ ”تم شاید اس شہر میں نئے ہو؟“

”ہاں۔“ جیمی نے جواب دیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ اس شہر میں کاروبار کے اچھے مواقع ہیں۔ میں یہاں کچھ سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ کون سی لائن اختیار کروں؟“

”یہ سرمایہ کاری کے لحاظ سے بہت منافع بخش شہر ہے۔“ اسٹیب نے جواب دیا۔ ”اور میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو ان امور کا ماہر ہے اور تمہاری بہت مدد کر سکتا ہے۔“

”اچھا؟“ جیمی نے کہا۔ ”کون ہے وہ؟“

”وہ اس شہر کا سب سے زیادہ بارہوش آدمی ہے۔“ اسٹیب نے کہا۔ ”وہ شہری کمپنی کا سربراہ بھی ہے۔ اس کا نام وان مرف ہے اور وہ اس شہر کے سب سے بڑے جنرل اسٹور کا بھی مالک ہے۔“

”میں نے یہ نام کبھی سنا نہیں۔“ جیمی نے ایک شان بے نیازی سے کہا۔ ”بہر حال تم اسے یہاں بلا لاؤ۔“

”ضرور۔“ اسٹیب نے کہا۔ پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ ”میں اسے تمہارا کام کیا بتاؤں؟“

”ٹریولیں۔ ایان ٹریولیں۔“ جیمی نے جواب دیا۔

جب وان مرف ریسٹوران میں داخل ہوا اور اس نے ”ایان ٹریولیں“ سے ملاقات کی تو اس کی آنکھوں میں بھی شناخت کی کوئی جھلک موجود نہیں تھی۔ نوجوان سرمایہ کار اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ دونوں میں تھوڑی دیر تک بارہوش پارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد وان مرف نے کہا۔ ”مسٹر ٹریولیں اگر تم مناسب سمجھو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ تم



میں ان کے درمیان تمام فاصلے مٹ گئے۔ مارگریٹ اپنا سب کچھ بار بیچی اور اس کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔  
”ہم شادی کر لیں گے جان من۔“ جیمی نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے باپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

دوسرے دن بھی جیمی مارگریٹ کو وان مرف کی اجازت سے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور کل والے واقعات آج پھر دہرائے گئے تھے۔ مارگریٹ نے کل بھی مزاحمت نہیں کی اور آج بھی۔ کئی ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ وان مرف بھی کوششے میں اتارنے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ اس الحق نو دولت کے بہت جلد تلاش کر کے دم لے گا۔

جیمی اپنے بٹول میں کپڑے بدل کر باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے مارگریٹ کھڑی تھی۔

”آ جاؤ مارگریٹ۔“ جیمی نے کہا۔

مارگریٹ اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور جیمی کو دیکھنے لگی۔

”ٹریولس۔“ مارگریٹ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

”اوہ...“ جیمی نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بڑی شان دار بات ہے۔ کیا تم نے اپنے باپ کو بتا دیا؟“

”کیا بات کرتے ہو ٹریولس۔“ مارگریٹ نے کہا۔ ”تم میرے باپ کو نہیں جانتے۔ وہ اس بات کو کبھی اچھا نہیں سمجھے گا۔ وہ ایک بڑا مختلف قسم کا انسان ہے۔“

”تو پھر چلو ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں۔“ جیمی نے کہا۔ ”ہم دونوں اسے یہ بات بتائیں گے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا ٹریولس۔“ مارگریٹ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مارگریٹ۔“ جیمی نے کہا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

مارگریٹ اور جیمی جب اسٹور میں داخل ہوئے تو وان مرف تنہا تھا۔

”سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے ٹریولس؟“ وان مرف نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اسے اس طرح ان دونوں کا اکٹھے آنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

”بالکل ٹھیک ہے وان مرف۔“ جیمی نے جواب دیا۔ ”تمہارے لیے خوش خبری یہ ہے کہ مارگریٹ ماں بننے والی ہے۔“

وان مرف بے وقوفوں کی طرح ان دونوں کو باری باری دیکھنے لگا۔ ”میں... میں... کچھ سمجھا نہیں۔“ اس نے یہ مشکل کہا۔

”بالکل سادہ سی بات ہے وان مرف۔“ جیمی نے کہا۔ ”وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

وان مرف کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کے ہونٹ کا پٹنے لگے۔ ”... غلط ہے... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”لیکن ایسا ہی ہوا ہے وان مرف۔“ جیمی نے کہا۔

”پھر... پھر تم دونوں کی فوراً شادی ہو جانی چاہیے۔“ وان مرف نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”شادی؟“ جیمی نے استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”کیا تم اپنی بیٹی کو ایک ایسے احمق شخص سے شادی کی اجازت دو گے جو تمہارے ہاتھوں میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا؟“

”نہم کیا باتیں کر رہے ہو ٹریولس...“

”میں ان کو ٹریولس نہیں ہے۔“ جیمی نے دانت پیس کر کہا۔ ”میں جیمی میک گریگر ہوں۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟“

وان مرف کے چہرے پر مزید الجھن کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ”یقیناً تم نہیں پہچانو گے۔ تمہارے خیال میں تو وہ لڑکا مرچکا ہے۔ تم نے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ لیکن میں ناشکر گزار نہیں ہوں وان مرف۔ میں تمہیں ایک تحفہ دے رہا ہوں۔

تمہارے گھر میں میرا بچہ پروان چڑھے گا۔“

ان الفاظ کے ساتھ جی جیمی باہر نکل آیا۔ وان مرف اور مارگریٹ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مارگریٹ کا دل شدت غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

”ذلیل فاحشہ۔“ وان مرف اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر پھینکارا۔ ”دور ہو جا میری نظروں سے۔“

مارگریٹ کو اس بختہ کھڑی ہونے تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چند منٹ کے اندر دنیا اتنی سی بدل گئی۔ جو کچھ ہوا وہ ناقابل یقین تھا۔

”دفع ہو۔“ وان مرف نے زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ”میں تیری دکھوں شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔“

مارگریٹ کو اپنے باپ کا چہرہ کی پگھل آدی کے چہرے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

وان مرف نے اسٹور پر ”بند ہے“ کا بورڈ لٹکا دیا اور خود اندر کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اسے اپنے جسم میں شدید کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔ جب یہ بات شہر میں پھیل گئی تو وہ

کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ جو کچھ ہوگا وہ تو قابل برداشت ہوگا اسے ہر قیمت پر اس خبر کو چھپانا ہوگا۔ اسے اپنی بیٹی کو کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر بھیجنا ہوگا۔

جب جیمی سن ڈاؤنزیہ ستوران میں داخل ہوا تو وہاں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ جیمی کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور اس نے سارے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا تم سب لوگوں کی توجہ چاہتا ہوں۔“

”تمام لوگوں کو میری طرف سے ان کی پسند کے جام....“ جیمی نے کہا۔

”کیا ہیروں کی کوئی نئی کان ہاتھ لگ گئی ہے؟“ کسی نے پوچھا۔

”اس سے بھی زیادہ۔“ جیمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم سب لوگوں کے لیے ایک دل چسپ اطلاع یہ ہے کہ وان مرف کی غیر شادی شدہ بیٹی مارگریٹ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے اور وان مرف چاہتا ہے کہ تم سب لوگ اس کی اس خوشی میں شریک ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میں ایمان ٹریولیس نہیں بلکہ جیمی میک گریر ہوں.... مارگریٹ کے ہونے والے بچے کا باپ۔“

”اف میرے خدا، اسمتھ نے آہستہ سے کہا اور اس کے ساتھ ہی پورے ہال میں لوگوں کے توجہ کو منبھنے لگے۔

ایک مہینے کے اندر اندر کلپ ڈرنٹ کے سارے لوگوں تک یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ دولت مند نوجوان ایمان ٹریولیس دراصل جیمی میک گریر ہے جسے آج سے تقریباً ایک سال پہلے وان مرف نے دھوکے سے لوٹ لیا تھا، اور اب اسی جیمی میک گریر نے اس طرح سے وان مرف سے اپنا انتقام لیا تھا۔ مارگریٹ کے بارے میں پورے شہر میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ اس سادہ اور معصوم لڑکی کے بارے میں لوگوں کے خیالات ایک دم بدل گئے۔

وان مرف کو جواپنے کمرے کے اندر بند تھا، ان ساری باتوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ مارگریٹ کو کلپ ڈرنٹ سے باہر بھیج دے گا۔ جہاں وہ اپنے ہونے والے بچے کو جنم دے سکے اور پھر بعد میں سوچے گا کہ اس بچے کا کیا کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ شہر والوں کو اس واقعے کی خبر ہونے سے پہلے ہی یہ بندوبست کر لے گا۔

وان مرف کئی گھنٹے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر باہر آیا اور تھوڑی دیر میں وہ مڑک پڑھا۔

”شام بہ خیر وان مرف!“ کسی نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے

کہ اب تم اپنے اسٹور میں نئے بچوں کے کپڑے بھی رکھنے والے ہو؟“ اور کھنکھہالا ہنستا ہوا گزر گیا۔

”مبارک ہو وان مرف۔“ ایک اور شخص نے کہا۔ ”تمہارے خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہونے والا ہے؟“

”تمہیں نواسے کی خواہش ہے یا نواسی کی وان مرف؟“ کسی اور نے فقرہ سنا۔

وان مرف پریشان ہو کر واپس اپنے اسٹور میں چلا گیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

جیمی جب واپس اپنے ہوٹل میں پہنچا تو مارگریٹ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ جیمی نے لاتعلقی سے پوچھا۔

”میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں ٹریولیس۔ میرا مطلب ہے جیمی۔“

”ہمارے درمیان بات کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا ہے۔“ جیمی نے خشکی سے کہا۔

”جیمی، میں اب بس تم سے محبت کرتی ہوں۔“ مارگریٹ نے کہا۔ ”مجھ سے نفرت مت کرو جیمی۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

”تم وان مرف کی بیٹی ہو۔“ جیمی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم اس کے نواسے یا نواسی کی ماں بننے والی ہو۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چل جاؤ۔“

مارگریٹ کہاں جا سکتی تھی؟ اسے اپنے باپ سے محبت تھی۔ اور اسے اس سے معافی کی ضرورت تھی، لیکن وہ اپنے باپ کو جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا لیکن باپ کے گھر جانے کے علاوہ مارگریٹ کے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

مارگریٹ ہوٹل سے نکل کر اپنے باپ کے اسٹور کی طرف روانہ ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے پاس سے گزرنے والا ہر شخص اس کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ بعض لوگ بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے تھے، لیکن مارگریٹ اپنا سر بلند کیے ہوئے اعتماد کے ساتھ چلتی رہی۔

”پاپا۔“ مارگریٹ نے اندرونی کمرے میں داخل ہو کر آہستہ سے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم آج ہی رات اس شہر سے چلی جاؤ۔“ وان مرف نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد پھر مجھے اپنی شکل یاد رکھنا سن رہی ہو نا؟“ اور اس نے اپنی جیب میں سے کچھ رقم نکال کر فرش پر پھینک دی۔ ”یہ رقم اٹھاؤ اور یہاں

سے اپنا کالا منہ لے کر نکل جاؤ۔“

”میں.... تمہاری بیٹی ہوں پایا۔“ مارگریٹ نے آہستہ سے کہا۔

”اور تم شیطان کے بچے کی ماں بننے والی ہو۔“ وان مرف نے تھارت سے کہا۔ ”لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ مگر جب تم چلی جاؤ گی تو وہ اس بات کو بھول جائیں گے۔“

مارگریٹ نے ایک آخری نظر اپنے باپ پر ڈالی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

شہر کے مضافات میں ایک سستا سا بورڈنگ ہاؤس تھا جس کی مالک مسز اووینس تھی۔ اس کی عمر پچاس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ وہ ایک خوش مزاج اور مہربان دل عورت تھی۔ مارگریٹ کو یہی جگہ ایسی نظر آئی جہاں اسے پناہ مل سکتی تھی۔

”مسز اووینس کیا تم مجھے یہاں کوئی کام فراہم کر سکتی ہو؟“

”کام؟“ مسز اووینس نے حیرت سے کہا۔ اس وقت تک اسے سارے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ ”تم کیا کام کر سکتی ہو؟“

”ہر قسم کا کام۔“ مارگریٹ نے جواب دیا۔ اور مسز اووینس نے اس زخم خوردہ کانپتی ہوئی سترہ سالہ لڑکی کو ترجیح آ میر نظر وں سے دیکھا اور اس کا دل ہمدردی کے جذبات سے لبر ہو بڑ گیا۔

”میں تمہیں قیام و طعام کی سہولتوں کے ساتھ ڈیڑھ پاؤنڈ ماہانہ دے سکتی ہوں۔“ مسز اووینس نے کہا۔ ”اس سے زیادہ میری سکت نہیں ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ مارگریٹ نے کہا۔

☆☆☆

جیمز میک گریگر کی دولت میں دن و نا اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا مکان خرید لیا تھا جہاں کئی نوکر تھے۔ بہت سے لوگ تھے۔ جو جیمز میک گریگر کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس کے خرچ پر پیسے سے تلاش کرنے جاتے تھے اور کامیابی کی صورت میں جیمز انہیں ان کا حصہ ادا کر دیتا تھا۔ جیمز کی دولت امرتیل کی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ اپنے گھر والوں کو بڑی بڑی رقمیں بھیج چکا تھا۔ جیسے جیسے جیمز کی شہرت بڑھتی گئی تھی، وہ بڑی بڑی تلاش کرنے والے زیادہ سے زیادہ لوگ اس کا تعاقب چاہنے لگے۔ اور جیمز کی دولت میں ان لوگوں کی محنت سے برابر اضافہ ہوتا گیا۔

شہر میں وہ پینک تھے اور جب ان میں سے ایک پینک دیوالیہ ہو گیا تو جیمز نے اسے خرید لیا۔ وہ اپنے دونوں

جیمز بھی چھوٹا تو وہ سونا بن جاتی تھی۔

وان مرف کو سب سے پہلا دکھا تو آج سے تقریباً ایک سال پہلے اس وقت پہنچا تھا۔ جب نمیب ڈیزرٹ میں بیہوش کی زبردست چوری ہوئی تھی۔ اور نا معلوم چور تقریباً پانچ لاکھ پاؤنڈ مالیت کے بیہوش چرائے گئے تھے۔ نمیب ڈیزرٹ میں دو پائر اور بھی تھے لیکن سب سے بڑا پائر وان مرف خود تھا اور اسی لیے نقصان کا اصل بوجھ بھی اسی کو برداشت کرنا تھا۔

پہلے تو وان مرف بیہوش کی تلاش میں آنے والے لوگوں کو اپنے دام میں جھنسا کر آٹھیں پائر شپ کا چھانڈا دے کر خوب دولت کماتا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی۔ بیہوش کی تلاش میں آنے والے اب سارے لوگ جیمز میک گریگر سے پائر شپ کرتے تھے۔ وان مرف کے سارے کارندے جن میں اسمت بھی شامل تھا اب جیمز کے لیے کام کر رہے تھے۔ وان مرف کی آمدنی کے راستے بند ہو گئے تھے۔ اس کا اسٹور بھی زیادہ تر بند رہتا تھا اور وہ دسکی کے نشے میں گھر کے اندر پڑا رہتا تھا۔ خریداروں کے لیے اب دوسرے کئی اسٹور موجود تھے۔ وان مرف گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔

رفتہ رفتہ نوٹ یہاں تک پہنچی کہ وان مرف نے بینک سے قرض لینا شروع کر دیا۔ وان مرف کو قرض دینے والا جیمز کا بینک تھا۔ اس نے اپنے بینک میجر کو ہدایت کر دی کہ وان مرف کو پوری دریاوی سے قرض دیا جائے اور اس سے رقم کی واپسی کا کوئی مطالبہ نہ کیا جائے۔ بینک میجر نے کہا جیمز کہ وان مرف کے پاس اب اتنے اثاثے نہیں ہیں کہ اسے بڑی بڑی رقمیں قرض دی جائیں۔ لیکن جیمز نے اس سے کہا کہ وہ وان مرف کو بے دریغ قرض دے۔ جتنا وہ نگتا ہے وہ اتنا قرض دے۔

مارگریٹ مسز اووینس کے بورڈنگ ہاؤس میں کام کر رہی تھی۔ ابھی بھی راستے قلی میں جیمز نے اس کی مدد بھیج دی تھی۔ لیکن جیمز اس سے کوئی بات کیے بغیر نکل پاتا۔ جیمز نے اب ایک سے زائد کام جو باری ادارے کو کر لیتے تھے۔ اس کے پاس دولت اب ہر طرف سے چھٹی چلی آ رہی تھی۔ جیمز نے نمیب ڈیزرٹ میں وان مرف کے دونوں پائر وں کے گھس کو خاموشی کے ساتھ خرید لیا تھا۔ اور اب وہ عفریب وان مرف کا حصہ بھی حاصل کر لینے کا خواہش مند تھا۔

وان مرف کے قرضوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شہر میں کوئی بھی اب اسے رقم دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وان مرف کو قرض صرف اس بینک سے مل سکتا تھا جو جیمز کی ملکیت تھا اور جیمز کی طرف سے اپنے میجر کو ہدایت تھی کہ وان مرف جتنا

بھی قرض مانگے، اسے دے دیا جائے۔

وان مرف کا جنرل اسٹوراب شاز ونا دربی کھلتا تھا۔ وان مرف صبح سے لے کر سہ پہر تک اپنے کمرے میں پڑا شرب پیتا رہتا تھا۔ اور شام کو وہ میڈم اسکن کے قحبہ خانے میں چلا جاتا تھا۔ میڈم اسکن کا قحبہ خانہ شہر کا سب سے زیادہ معیاری قحبہ خانہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک مہنگا قحبہ خانہ تھا اور یہاں مردوں کا دل پہلانے کے لیے لوجوان اور حسین عورتیں ہمہ وقت موجود رہتی تھیں۔ جیسی بھی اکثرائیں اس قحبہ خانے میں گزارتا تھا۔

وان مرف کے پاس جتنے بھی اثاثے تھے ان سب کو وہ رہن رکھ کر قرض لے چکا تھا۔ ان میں نمیب ویزرٹ میں اس کا حصہ بھی شامل تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے گھوڑے اور گاڑی کو بھی رہن رکھ چکا تھا۔ اور اب جیسی کی باری تھی۔

”وان مرف کا سارا حساب تیار کرو۔“ ایک دن اس نے اپنے بینک منیجر کو ہدایت دی۔ ”اسے نوٹس دو کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سارا قرض ادا کر دے، ورنہ اس کی ساری جائیداد قرق کر لی جائے گی۔ صرف چوبیس گھنٹے کا نوٹس....“

جیسی اپنے دفتر کی عمارت کی کھڑکی سے وان مرف کو اسٹور سے باہر نکلنے دیکھ رہا تھا۔ وان مرف کی ساری جائیداد قرق کر لی گئی تھی۔ اس کے پاس اب کچھ نہیں باقی بچا تھا۔ وہ اسٹور کے سامنے کھڑا ہوا بلیکس جیپ کا کراؤنر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اور کہاں جائے۔ اس کا سب کچھ جھینا جا چکا تھا۔

اس رات جب جیسی میڈم اسکن کے قحبہ خانے میں گیا تو میڈم اسکن نے اس سے کہا۔ ”کیا تم نے خبر لی جیسی؟ اب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے وان مرف مر گیا؟“

وان مرف کی تدفین شہر سے باہر قبرستان میں ہوئی۔ دفنانے والے عمل کے علاوہ تدفین کے موقع پر صرف دو افراد موجود تھے۔ جیسی اور مارگریٹ۔ مارگریٹ ایک ڈھیلیا ڈھالا سا سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ زرد اور پیر نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں قبر کی مخالف سمتوں میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور تابوت کو قبر میں اتارے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مارگریٹ نے جیسی کی طرف دیکھا اور ایک لحظے کے لیے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور تب مارگریٹ کو جیسی سے شدید نفرت پیدا ہوئی۔ اس نے جیسی کی طرف سے اپنی نظریں ہٹائیں اور قبر میں رکھے ہوئے تابوت کو دیکھنے لگی۔ جب اس نے دوبارہ جیسی کی طرف دیکھا تو جیسی جا چکا تھا۔

کلب ڈرفٹ میں لکڑی کی دو عمارتیں موجود تھیں جو اسپتال کا کام دیتی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر گندی اور مضرت تھیں کہ وہاں

ایک شخص ہونے والوں کے مقابلے میں مرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بچوں کی ولادت گھروں میں ہی ہوا کرتی تھی۔ جب مارگریٹ کے باپ ولادت کا وقت آن پہنچا تو مسز اوینس نے ایک سیاہ قلم ڈاکی کی خدمات حاصل کیں جس کا نام تھا تھا۔

اس رات مارگریٹ نے ایک صحت مند اور خوب صورت لڑکے کو جنم دیا۔ مارگریٹ نے اس کے باپ کے نام پر اس کا نام بھی جمی رکھا۔

مارگریٹ کو امید تھی کہ لڑکے کی پیدائش کی خبر سن کر جیسی ضرور اس کے پاس آئے گا اور اپنے بیٹے کو دیکھے گا۔ لیکن دن پردن گزر رہے تھے اور جیسی نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ تب اس نے ایک لڑکے کے ہاتھ جیسی کو پیغام بھیجوا یا۔ لڑکا واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ جیسی کہتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔

کئی ہفتے گزر گئے۔

”کوئی بات نہیں۔“ مارگریٹ نے سوچا۔ ”جیسی کا بیٹا خود اس کے پاس جائے گا۔“

چند روز کے بعد مارگریٹ نے مسز اوینس کو بتایا کہ وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر باہر جانا چاہتی ہے۔ مسز اوینس نے اس سے کہا کہ بچہ جھوٹا ہے اور سفر کرنے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن مارگریٹ نے کہا کہ وہ بچے کو ساتھ نہیں لے جائے گی وہ شہر میں ایک جگہ اس کا بندوبست کرے جائے گی۔

جیسی میک گرینر نے ایک بہت بڑا مکان بوالیا تھا جس کے ارد گرد بڑا خوب صورت باغ تھا۔ بوجینا ٹیلی نامی ایک معمر عورت گھر کے سارے انتظامات سنبھالتی تھی اور سارے نوکروں کی نگرانی کرتی تھی۔

مارگریٹ نے دس بجے اپنے بچے کو گود میں لیے ہوئے جیسی کے گھر پہنچی۔ اسے معلوم تھا کہ جیسی اس وقت دفتر میں ہوئے۔ مسز ٹیلی نے دروازہ کھولا اور جیت سے مارگریٹ اور اس کے بچے کو گود میں لے لی۔ پھر۔۔۔ کے دونوں غرٹ مسز ٹیلی کو بھی اس واقعے کی ساری تفصیلات کا علم تھا۔

”مسٹر میک گرینر گھر پر نہیں ہیں۔“ مسز ٹیلی نے کہا۔ اور دروازہ بند کرنے لگی۔ مارگریٹ ایک دم اندر داخل ہو گئی۔

”میں مسٹر میک گرینر سے ملنے نہیں آئی ہوں۔“ مارگریٹ نے کہا۔ ”میں ان کے بیٹے کو ان کے پاس لائی ہوں۔“

”معاف کرنا مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“ مسز ٹیلی نے گھبرا کر کہا۔ ”بہتر ہے کہ تم اسے لے جاؤ۔“

”میں ایک ہفتے کے لیے باہر جا رہی ہوں۔“ مارگریٹ نے مسز ٹیلی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسی۔۔۔ پس

آؤں کی تو اسے لے جاؤں گی۔ اس کا نام چینی ہے۔“  
 ”نہیں۔“ مسز ٹیلی سخت خوف زدہ ہو گئی۔ ”تم اسے یہاں  
 نہیں چھوڑ سکتیں۔ مسز میک گرگریگر۔۔۔۔۔“

”اگر تم اسے نہیں سنبھالتیں تو میں اسے سیڑھیوں پر چھوڑ کر  
 چلی جاؤں گی۔“ مارگریٹ نے کہا اور بچے کو مسز ٹیلی کے  
 بازوؤں میں تھما کر وہاں سے چل دی۔ مسز ٹیلی کچھ نہ کر سکی۔  
 مسز ٹیلی نے چینی میک گرگریگر کو بھی اس قدر غیظ و غضب کے  
 عالم میں نہیں دیکھا تھا۔

”تم نے کس قدر حماقت کا مظاہرہ کیا ہے۔“ چینی دھاڑ رہا  
 تھا۔ ”تمہیں چاہیے تھا کہ اسے باہر نکال کر دروازہ بند  
 کر لیتیں۔“

”اس نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔“ مسز ٹیلی نے  
 خجالت سے کہا۔ ”وہ ایک ہفتے کے بعد آکر اسے لے جائے  
 گی۔“

”میری طرف سے جہنم میں جائے۔“ چینی نے چیخ کر کہا۔  
 ”میں اس بچے کا کیا کروں؟ تم نے فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تم  
 ہی اسے بھگتو۔ اب تم ہی اسے سنبھالو ورنہ کسی کو دے آؤ۔“  
 ”میں اسے سنبھال لوں گی۔“ مسز ٹیلی نے کہا۔ اور اسے  
 اپنے کمرے میں لے گئی۔

اس رات چینی میک گرگریگر بڑے چین رہا۔ کئی بار اس کے  
 کانوں میں بچے کے رونے کی آوازیں آئیں۔ اور اس کی  
 آنکھ کھل گئی۔ لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اسے بچے کے  
 رونے پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ اور صبح کو اسے اس وقت اپنے آپ  
 پر مزید حیرت ہوئی جب اس نے مسز ٹیلی سے بچے کے بارے  
 میں بالکل غیر ارادی طور پر پوچھا۔ ”وہ کیسا ہے؟ میں نے رات  
 کو کئی بار اس کے رونے کی آواز سنی۔“

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مسز میک گرگریگر۔“ مسز ٹیلی نے جبکہ  
 ہونے کہا۔ ”اپنے طور پر ہی کرتی ہیں۔“

اور اگلی رات کو مسز چینی کے قدم خود بخود مسز ٹیلی کے کمرے  
 کی طرف اٹھ گئے جہاں وہ بچے کے گہوارے کے پاس بیٹھی  
 ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ مسز ٹیلی اسے دیکھ کر ایک دم  
 کھڑی ہو گئی۔ ”مسز میک گرگریگر کیا تمہیں کسی کام کے لیے میری  
 ضرورت ہے؟“

”نہیں مسز ٹیلی؟“ چینی نے کچھ حیرت سے جواب دیا۔  
 ”مجھے ذرا سچے کے رونے کے شور سے کچھ تکلیف ہو رہی تھی۔“ وہ  
 گہوارے کے پاس آکر بچے کو دیکھنے لگا۔

چینی نے یہی مرتبہ اپنے بیٹے کو دیکھا اور یکایک اس کا دل

ایک عجیب سے احساس مسرت سے سرشار ہو گیا۔ بچہ بہت  
 خوب صورت اور صحت مند تھا۔ جیسی تھوڑی دیر اسے دیکھتے  
 رہنے کے بعد اپنے کمرے میں واپس آ گیا، لیکن اس کی نیند  
 اچاٹ ہو چکی تھی۔

چینی میک گرگریگر کے مختلف اداروں میں کام کرنے والوں کی  
 تعداد تقریباً پچاس تھی۔ انہی میں ایک سولہ سالہ امریکی لڑکا ڈیوڈ  
 بلک ویل بھی تھا۔ وہ ایک فورمین کا بیٹا تھا جو بیروں کی تلاش  
 میں جنوبی افریقہ آ رہا تھا لیکن اسے کچھ نہ مل سکا اور اس کے پاس  
 رقم ختم ہو گئی۔ فورمین کو چینی نے اپنی ایک کان پر کام کرنے کے  
 لیے بھیج دیا اور اس کے بیٹے ڈیوڈ بلک ویل کو چینی نے اپنی کمپنی  
 میں ملازم رکھ لیا۔ ڈیوڈ بلک ویل ایک نہایت ذہین اور ہوشیار  
 لڑکا ثابت ہوا اور اس نے چینی کا اعتماد حاصل کر لیا۔

”ڈیوڈ؟ کیا تم جانتے ہو کہ بچے کن چیزوں سے بھگتے ہیں؟“  
 صبح کو چینی نے ڈیوڈ سے پوچھا۔

”کھلونوں سے۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔

”تو پھر ڈھیر سے کھلونے لے آؤ۔“ چینی نے کہا۔

ایک ہفتے کے بعد مارگریٹ ٹھیک ایسے وقت پر واپس آئی  
 جب چینی گھر میں موجود تھا۔ چینی نے اسے پیشکش کی کہ وہ بچے  
 کو بالنے کے لیے تیار ہے۔ مارگریٹ نے یہ پیشکش مسرور  
 کر دی اور کہا کہ اسے اپنا بچہ واپس چاہیے۔

”ہمارے درمیان سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔“ چینی نے کہا۔ ”تم  
 بچے کے ساتھ یہاں رہ سکتی ہو۔ اس کی گورنس کی حیثیت سے۔  
 تم اور کیا چاہتی ہو؟“

”میں اس کی گورنس کی حیثیت سے نہیں۔ اس کی ماں کی  
 حیثیت سے رہنا چاہتی ہوں۔“ مارگریٹ نے کہا۔ ”مجھے اپنے  
 بچے کے لیے اس کے باپ کا نام چاہیے۔“ چینی نے کوئی  
 جواب نہ دیا اور مارگریٹ اپنے بیٹے کو لے کر وہاں سے چلی  
 گئی۔

اس سے اگلی صبح مارگریٹ نے امریکا جانے کی تیاریاں  
 شروع کر دیں۔ اس نے اپنی رقم جمع کر لی تھی کہ اب وہ یہاں  
 سے امریکا کا سفر کر سکتی تھی۔ وہ چینی کے رویے سے بالکل ہی  
 دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ چینی اس کے بچے کو رکھنے کے لیے تیار تھا  
 لیکن اسے اپنی بیوی بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور یہ صورت  
 حال مارگریٹ کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا  
 کہ اب وہ جنوبی افریقہ کی سرزمین کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے  
 گی۔

چینی نے ڈیوڈ بلک ویل کو بلایا اور اس سے کہا۔ ”تمہیں



اس سے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ اسے صرف اپنے بیٹے سے دلچسپی تھی۔ جیسی جب گھر پر موجود ہوتا تو اپنے بیٹے کے ساتھ کھلتا رہتا۔ لیکن باہر کے لوگوں کو ان دونوں کے درمیان اس کشیدگی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ سب لوگ مارگریٹ کو ایک بہت خوش قسمت عورت سمجھتے تھے۔ ایک ہی دن کے اندر مارگریٹ کا سماجی رتہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ وہ اب مسز مارگریٹ میک گرگریٹ تھی۔ اور جب نئے جیسی کے ساتھ لے کر باہر نکلتی تو ہر طرف سے لوگ دعا سلام کے لیے بڑھتے۔ اس پر دعوت ناموں کی بوچھاڑ ہو جاتی۔

مارگریٹ کی امیدوں کا واحد مرکز اس کا بیٹا تھا۔ وہ اسی کو دیکھ کر رہی تھی۔ اس کا شوہر تو اس سے آٹھ مہینے قبل انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن مارگریٹ کو اپنے شوہر سے محبت تھی۔ اس کی تمام تر بے اتفاقی سردہری اور توہین آمیز رویے کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی تھی۔

جیسی کو کاروباری سلسلے میں کیپ ٹاؤن جانا پڑا۔ وہاں اس کی ملاقات ہانڈا سے ہوئی۔ دونوں پرانے دوست ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ ہانڈا کو جیسی میک گرگریٹ کی خوشحالی اور کاروباری ترقی کے بارے میں سب کچھ پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اسے ان طرف کی موت مارگریٹ کے ہاں پہنچنے کی پیدائش اور جیسی کی شادی کے بارے میں سب کچھ پتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بیروں کا علاقہ نمیب ڈیزرٹ جو پہلے ان طرف اور اس کے پانچروں کی ملکیت تھا۔ اب پورے طور سے جیسی کی ملکیت ہے۔ ہانڈا خود اب ایک فارم کا مالک تھا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔

”میں تم سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔“ ہانڈا نے جیسی سے کہا۔ ”میں تمہیں ایک معاملے میں خبردار کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ جیسی نے پوچھا۔

”نمیب ڈیزرٹ میں تمہارا سپر وائزر۔ زیر زمین سیاہ فام کارکنوں پر بہت ظلم کر رہا ہے۔ کارکن اس سے شدید نفرت کرتے ہیں اور مجھے دے رہے کہ کسی دن ظلم سے تنگ آ کر وہ بغاوت کر دیں گے۔ تمہارا بہت نقصان ہو جائے گا جیسی! افریقہ افریقوں کا ہے اور یہ بات اب مقامی لوگ پہلے سے زیادہ بہتر سمجھنے لگے ہیں۔ تم نے سیاہ فام افریقی رہنما جون ٹینگو جاوا بو کا نام سنا ہوگا۔“

”میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہے۔“ جیسی نے کہا۔

”وہ ایک طوفان کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

ایک اہم کام انجام دینا ہے ڈیوڈ۔ تم مسز اووینس کے بورڈنگ ہاؤس جاؤ اور وہاں مارگریٹ ورن صرف نامی خاتون سے ملو اور اس سے کہنا کہ میں اسے بیس ہزار پاؤنڈ کی پیشکش کر رہا ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ مجھے اس کے بدلے میں کیا چاہیے۔“ اور جیسی نے تین ہزار پاؤنڈ کا چیک لکھ کر ڈیوڈ کو دے دیا۔ ڈیوڈ تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گیا۔ اس نے چیک کے پیچھے ہونے والے جیسی کے حوالے کر دیے۔

”شاید وہ زیادہ رقم کی طلب گار ہے۔“ جیسی نے سوچا۔ اسی سہ پہر کو وہ مسز اووینس کے بورڈنگ ہاؤس پہنچا۔

”مجھے مس مارگریٹ وان حرف سے ملنا ہے۔“ اس نے مسز اووینس سے کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم اب اس سے نہیں مل سکتے۔“ مسز اووینس نے کہا۔ ”وہ امریکا روانہ ہو چکی ہے۔“

جیسی کے پیٹ پر جیسے سی نے زوردار گھونسا مار دیا ہو۔ اسے ساری دنیا خراب لگنے لگی۔

”وہ کب گئی؟“ جیسی نے پوچھا۔

”وہ اور اس کا بیٹا دو پہر کی گاڑی سے ورسٹر روانہ ہو گئے ہیں۔“ مسز اووینس نے کہا۔ ”وہاں سے وہ جرمن کے ذریعے نیپ ٹاؤن جائیں گے اور پھر مریکا۔“

جیسی جب ورسٹر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو کیپ ٹاؤن جانے والی ٹرین وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں بہت رش تھا۔ جدید جیسی نے مارگریٹ کو ڈھونڈ نکالا۔ مارگریٹ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”اپنا سامان اتار لو۔“ جیسی نے حکم دیا۔ انداز میں اس سے کہا۔ ”تم ہمیں نہیں جا رہی ہو۔“

”اس بار تم قلمی قلم کی پیشکش کر رہے ہو؟“ مارگریٹ نے طنز پر انداز میں پوچھا۔

”جیسی نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مارگریٹ کے بازوؤں میں بڑے آرام سے سو رہا تھا۔

”میں تمہیں شادی کی پیشکش کر رہا ہوں۔“ جیسی نے کہا۔

اس کے تین روز بعد ایک مختصر اور سادہ سی تقریب میں ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے موقع پر صرف ڈیوڈ بلیک ویل ہی موجود تھا۔

جب وہ گھر واپس آئے تو جیسی نے مارگریٹ سے کہا۔ اگر تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ڈیوڈ بلیک ویل کو بتا دینا۔“

مارگریٹ نے وہ رات تنہا اپنے بیک دروم میں گزار دی اور اس کے بعد آنے والی تمام راتیں اس نے تنہا ہی گزاریں۔ جیسی

”میں اس کے پیروں میں سے ایک ہوں۔“ بانڈا نے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ جیمی نے کہا۔ ”میں غیب ڈیزرٹ کے حالات سدھارنے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔“  
 ”یہ اچھی بات ہوگی۔“ بانڈا نے کہا۔ ”تم ایک دولت مند اور طاقت ور آدمی ہو جیسی! اور مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہے۔ میں غیب ڈیزرٹ میں اپنے ساتھیوں کو بتاؤں گا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ وہ اطمینان رکھیں۔“  
 ”ہاں بانڈا یہ میرا وعدہ ہے۔“ جیمی نے کہا۔

جیمی نے کلب ڈرفٹ واپس جانے کے بعد ڈیوڈ کو غیب ڈیزرٹ بھیجا اور ڈیوڈ نے زیر زمین سے کہا کہ باس کی ہدایت ہے کہ کالوں پر ظلم بند کیا جائے۔ ان کی اجازتوں میں اضافہ کیا جائے لیکن زیر زمین ایک سخت گیر آدمی تھا۔

۱۸۹۰ء تک کلب ڈرفٹ ایک بڑا شہر بن چکا تھا۔ جیمی کو یہاں رہتے ہوئے سات سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے بیٹے کی عراب چھ سال کے قریب تھی اور گھر کے اندر جیمی کی توجہ صرف اپنے بیٹے پر مرکوز رہتی تھی۔ مارگریٹ کے ساتھ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جیمی نے اب اپنے سرے کا روپ بازی اور دل کو ملا کر ایک واحد بڑی بیٹی قائم کر دی تھی۔ جس کا نام اس نے کروگر برینٹ کہہ دیا تھا۔ ڈیوڈ بلیک ویل، جو پہلے جیمی کا سیکرٹری تھا، بعد میں اس کا پرنسپل اسسٹنٹ بنا اور اب آٹیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس کے کاروبار کا جنرل مینجر تھا۔ ڈیوڈ ایک نہایت مختلق ایماندار، ہوشیار اور ذہین انسان ثابت ہوا تھا اور جیمی نے اس کی صلاحیتوں کو پہچان کر اس کی پوری قدر کرتی تھی۔

مارگریٹ کی شادی شدہ زندگی میں صرف ایک رات ایسی آئی تھی جب جیمی شراب کے نشے میں دھت رات کے وقت اس کے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ واحد رات تھی جو انہوں نے میاں بیوی کی حیثیت میں گزاریں۔ اور اس کے بعد مارگریٹ نے ایک خوب صورت بچی کو جنم دیا۔ اس نے اپنی بچی کا نام کیٹ رکھا۔ مارگریٹ کے بیٹے اور بیٹی کی عمروں میں چھ سال کا فرق تھا۔

اور اسی دن جب کہ جیمی اپنے شاندار آفس میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک بانڈا بغیر کسی پیشگی اطلاع اور دستک کے دروازہ کھول کر اندر گھس آیا۔

”ارے تم؟“ جیمی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”غیب ڈیزرٹ میں فساد ہو گیا ہے۔“ بانڈا نے اسے بتایا۔

”کیا؟“ جیمی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”کیا ہوا؟“  
 ”ایک سیاہ فام لڑکا جس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی ایک ہیرا چراتے ہوئے پکڑا گیا۔“ بانڈا نے بتایا۔ ”تمہارے سپروائزر زیر زمین نے دوسرے تمام کارکنوں کے سامنے اس کے کوڑے لگوائے۔ لڑکا مر گیا اور سیاہ فام کارکن بے قابو ہو گئے۔“

”میرے خدا۔“ جیمی نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”میں نے اس کم بخت کو ہدایت دی تھی کہ کسی کو کوڑے نہ مارے جائیں۔ میں اسے نکال باہر کروں گا۔“

”اب یہ ممکن نہیں۔“ بانڈا نے جواب دیا۔  
 ”کیوں؟“ جیمی نے پوچھا۔

”کالے اسے پکڑ کر لے گئے ہیں۔“ بانڈا نے کہا۔ ”اب اس کا کوئی پتا نشان نہیں مل سکتا۔ انہوں نے اب تک اس کا خاصا وقت ضائع کیا ہوگا۔ صورت حال قابو سے باہر ہے۔“  
 جیمی فوراً ہی غیب ڈیزرٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ بانڈا نے سمجھا یا بھی کہ اس کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے کیونکہ جڑوں کے کو مارا گیا ہے، اس کا تعلق بارو لوگ قبیلے سے ہے اور یہ لوگ نہ تو فرواموش کرتے ہیں اور نہ معاف کرتے ہیں۔ لیکن جیمی نہیں مانتا۔

جیمی نے وہاں پہنچتے ہی سفید فام پولیس والوں کو فریگ سے روکا۔ میدان سیاہ فام مردوں اور عورتوں اور بچوں کی لاشوں سے پڑا ہوا تھا۔ لکڑی کی عمارتیں دھڑا دھڑا جل رہی تھیں۔ جیمی نے کالے لوگوں کے لیڈر کو بلوا کر سمجھانے کی کوشش کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ کالے لوگوں کے لیڈر نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ زیر زمین کی تلاش جاری رکھی لیکن اس کا کوئی پتا نہ تھا۔

اچانک پیچھے سے ایک گھڑ سوار تیز سی سے بھاگتا ہوا آیا۔ وہ ڈیوڈ تھا۔ وہ درپاز آتے ہی اپنے گھوڑے پر سے کود پڑا۔  
 ”مسٹر میک گرہگر۔“ ڈیوڈ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بیٹا غائب ہو گیا ہے۔“

کلب ڈرفٹ کی آدھی آبادی جیمی کے بیٹے کی تلاش میں تھی۔ آس پاس کے علاقوں کا کون کونہ چھان مارا گیا تھا۔ لیکن نہ جیمی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ مارگریٹ کا شدت غم سے برا حال تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کیٹ کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔

آدھی رات کو مارگریٹ کے بیڈروم کی کھڑکی آہستہ سے کھلی۔ کود کر اندر آنے والا بانڈا تھا۔ وہ کیٹ کے گہوارے میں

دوسری لڑکیوں کے لیے باعث کشش ہوتی تھیں۔ وہ ڈیوڈ کے ساتھ کانوں میں جاتی، مختلف ادروں میں جاتی۔ انسانوں اور مشینوں کو کام کرتے ہوئے دیکھتی اور ان ساری باتوں سے اسے بڑا سکون حاصل ہوتا۔ اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا کہ یہ سارے ادارے یہ ساری دولت یہ ساری کانیں یہ سب اس کی ہیں وہ ایک دن ان کی مالکہ بنے گی۔۔۔

جب کیٹ چودہ سال کی ہوئی تو مارگریٹ نے اسے لندن کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا۔ کیٹ وہاں جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ لیکن مارگریٹ اور ڈیوڈ کے سمجھانے سے وہ یہ مشکل اس کے لیے آدھ ہوئی۔ ان لوگوں نے کلپ ڈرنٹ سے کیپ ٹاؤن تک کا سفر اپنی پرائیویٹ ریلوے کار میں کیا اور وہاں سے وہ جہاز کے ذریعے ساؤتھیمپٹن روانہ ہو گئے۔ مارگریٹ کیپ ٹاؤن سے واپس کلپ ڈرنٹ چلی گئی اور ڈیوڈ کیٹ کو ساتھ لے کر ساؤتھیمپٹن (انگلینڈ) روانہ ہو گیا۔

اسکول کے شب و روز کیٹ کے لیے سخت آزمائش بنے والے تھے۔ اسے یہاں کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ ڈیوڈ بھی تنہا ایک بار کاروباری سلسلے میں لندن آیا اور اس نے کیٹ سے ملاقات کی۔ کیٹ کے لیے وہ بڑا خوشگوار دن تھا۔

گرمیوں کی تعطیلات میں کیٹ گھر آئی اور اس کی ماں نے محسوس کیا کہ کیٹ لندن جا کر بالکل خوش نہیں ہے۔ تاہم اسے امید تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اس نئے ماحول کی عادی ہو جائے گی اور اسکول سے کچھ سیکھ کر ہی نکلے گی۔

اس سے اگلے سال جب کیٹ چھٹیوں میں گھر آئی تو کلپ ڈرنٹ کے بہت سے متول اور صاحب حیثیت نوجوان اس کے ارد گرد منڈلانے لگے۔ لیکن کیٹ نے ان میں سے کسی میں بھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ڈیوڈ ان دنوں امریکا گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو کیٹ اس سے مل کر بہت خوش ہوئی۔

بالآخر کیٹ نے اسکول کی تعلیم ختم کرنی اور جب وہ گھر واپس آئی تو اسے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ اس کی ماں بیمار تھی۔ وہ بہت کمزور اور زرد ہو گئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

کیٹ اپنی ماں کے بستر کے برابر بیٹھ گئی۔ ”ممی، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے گلگہرا آواز میں کہا۔

مارگریٹ نے کیٹ کا ہاتھ تھام لیا اور کمزور آواز میں بولی ”میں تیار ہوں ڈارلنگ! میرا خیال ہے کہ میں اسی وقت سے تیار ہوں جب تمہارا باپ رخصت ہوا تھا۔ مجھے تو بہت پہلے اس

کے پاس چلے جانا چاہیے تھا، لیکن میں صرف تمہاری وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو، تمہیں میری ضرورت نہیں رہی ہے۔“

اس کے تین دن کے بعد مارگریٹ کا انتقال ہو گیا۔

ماں کی موت نے کیٹ کو وحشت زدہ کر دیا۔ اسے اپنے باپ اور اپنے بھائی کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس نے ان کے بارے میں صرف کہانیاں سنی تھیں۔ صرف اس کی ماں ہی ایک ایسی ہستی تھی جو اس کے قریب تھی اور اب وہ بھی رخصت ہو گئی تھی۔ اچانک کیٹ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی اور اب چالیس سال ڈیوڈ ہی وہ واحد شخص تھا جو اس کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ ڈیوڈ نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔

”چند برسوں کے بعد تم کروگر بریٹ کمپنی اور اس کے سارے اثاثوں کی مالک ہو گئی۔“ ڈیوڈ نے ایک دن کیٹ سے کہا۔

”تم ایک بہت ہی مال دار نوجوان خاتون ہو۔ تم جاہو تو اس کمپنی کو سترہ سو لاکھ پونڈ کے عوض فروخت کر سکتی ہو! اگر جاہو تو اسے قائم رکھ سکتی ہو۔ وقت آنے پر تمہیں اس کا فیصلہ کرنا ہو گا۔“

”میں اس کا فیصلہ کر چکی ہوں کیٹ نے پر عزم لہجے میں کہا۔ ”میرا باپ ایک چور تھا ڈیوڈ! ایک شان دار چور کاش میں نے اسے دیکھا ہوتا۔ میرا نانا بھی چور تھا۔ پہلے میرے نانا نے میرے باپ کو دھوکا دیا اور پھر میرے باپ نے میرے نانا کے ہیرے چرائے اور اسے تلاش کر کے ختم کر دیا۔ بے نایہ مزے کی بات؟ نہیں! میں اپنے باپ کی کمپنی کو کبھی نہیں بیچوں گی وہ ایک زبردست آدمی تھا۔“ پھر اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت تک اسے نہیں بیچوں گی جب تک تم کمپنی کو چھوڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔“

”میں اس وقت تک یہاں موجود رہوں گا جب تک تم میری ضرورت محسوس کرو۔“ ڈیوڈ نے آہستہ سے کہا۔

”میں برنس اسکول میں داخلہ لے رہی ہوں کیٹ نے کہا۔ ”برنس اسکول میں؟“ ڈیوڈ نے حیرت سے کہا۔

”یہ ۱۹۱۰ء کا سال ہے ڈیوڈ۔“ کیٹ نے کہا۔ ”جو ہانس برگ میں ایک برنس اسکول موجود ہے جہاں عورتیں بھی داخلہ لے سکتی ہیں۔“

برنس اسکول کی تعلیم دو سال تک جاری رہی۔ اور جب کیٹ کلپ ڈرنٹ واپس آئی تو اس کی بیسویں سالگرہ کا وقت آ گیا

تھا۔ ڈیوڈ اسٹیشن پر اسے لینے آیا اور وہ جوش مسرت کے عالم میں اس سے لپٹ گئی۔  
اکثر کیٹ کو نہ جانے کیوں یہ خیال آتا تھا کہ ڈیوڈ کسی نہ کسی دن بڑی خاموشی سے اس سے شادی کی درخواست کرے گا۔  
لیکن دن پر دن گزر گئے تھے اور ڈیوڈ نے ابھی تک ایسی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔

اگلے دن صبح کو کیٹ اپنے نئے آفس میں آئی۔ اس کا دل ایک شہانہ احساس انفرادیت سے سرشار تھا۔ کروگر برینٹ کمپنی کے دفاتر ایک شان دار عمارت میں قائم تھے اور کمپنی کا کاروبار بیسیوں مختلف شاخوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس کا تھا۔ وہ اس سارے کاروبار کی تنہا مالک تھی۔ کیٹ کو پہلی بار اپنی قوت کا صحیح معنوں میں احساس ہوا میجر ول اسٹنٹ میجر ول سپروائزر اور دیگر اعلیٰ افسران کا ایک لشکر کا لشکر موجود تھا۔ وہ سب کے سب مودبانہ انداز میں ڈیوڈ کے پاس آتے اس سے ہدایتیں لینے اور چلے جاتے۔  
کچھ دیر بعد ڈیوڈ کیٹ کو ایک وسیع و عریض پرائیویٹ ڈرائنگ روم میں لے گیا جو کیٹ کے آفس سے ملا ہوا تھا۔ وہاں پیسے چرے اور مجسٹ آکھوں والا ایک نوجوان آدمی ان کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ براڈ راجرس ہے۔“ ڈیوڈ نے کیٹ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”براڈ اپنی نئی باس سے ملو۔ کیٹ میک گرگری۔“  
”تم مل کر خوش ہوئی مس میک گرگری۔“ براڈ راجرس نے کہا۔

”براڈ راجرس ہمارا خفیہ ہتھیار ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”کروگر برینٹ کمپنی کے بارے میں وہ اتنا جانتا ہے جتنا کہ میں جانتا ہوں۔ اگر میں بھی چلا جاؤں تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ براڈ سب کام سنبھال لے گا۔“  
کھانے کے بعد وہ لوگ جنوبی افریقہ کے حالات کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

”جلد ہی کافی بنگاسے ہونے کے آثار نظر آرہے ہیں۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”حکومت نے تمام رنگ دار باشندوں پر نئے ٹیکس عائد کر دیے ہیں۔ یہ نئے ٹیکس ان لوگوں پر بہت زیادہ بوجھ ثابت ہوں گے۔“

کیٹ بانڈا کے بارے میں سوچنے لگی اور بات چیت کا رخ دوسرے موضوعات کی طرف بدل گیا۔  
کیٹ اپنی نئی زندگی سے بہت خوش تھی۔ وہ تمام فیصلوں میں

ڈیوڈ کے ساتھ شریک ہوتی اور دیکھتی کہ کس طرح روپیے کو روپیہ بھینچتا ہے۔ کروگر برینٹ کے اثاثوں میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ نئے نئے آرڈر مل رہے تھے۔ نئی نئی موضوعات منظر عام پر آ رہی تھیں۔  
کیٹ اپنے وسیع و عریض مکان میں تہوار جی جی جہاں اس کے علاوہ صرف نوکر تھے ڈیوڈ ہر جمعہ کی رات کو ڈنر پر وہاں آتا تھا۔

جب کیٹ نے اپنی اکیسویں سالگرہ منائی تو کروگر برینٹ لمیٹڈ کمپنی کے سارے اثاثے اس کے نام منتقل کر دیے گئے۔ اب وہ قانونی طور پر باغ و بوٹی تھی اور کمپنی کی بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ اس کی خوشی میں ڈیوڈ برابر کا شریک تھا۔  
کیٹ ان دنوں کاروباری سلسلے میں امریکا کی ہوئی تھی جب یہ واقعہ پیش آیا۔

ڈیوڈ کو اپنے ایک پرانے دوست اونیل کا جو سان فرانسسکو میں رہتا تھا پیغام ملا کہ وہ اپنی بیٹی جوزیفائن کے ساتھ کلپ ڈرٹ آ یا ہوا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اونیل بیروں کا کاروبار کرتا تھا اور اسی سلسلے میں اکثر ڈیوڈ سے اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ڈیوڈ کا کاروباری معاملات میں اتنا زیادہ مصروف تھا کہ وہ اپنی شام اونیل اور اس کی بیٹی کے ساتھ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اونیل کی درخواست کو وہ رد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ تھوڑا سا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزار کر معذرت کر کے چلا آئے گا۔

ان لوگوں کی ملاقات گرائنڈ ہول کے ڈائننگ روم میں ہوئی اور ڈیوڈ جوزیفائن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بے انتہا خوب صورت عورت تھی اور اس کی عمر کوئی تیس سال کے قریب تھی۔ ڈیوڈ کی وہ شام اونیل اور جوزیفائن کے ساتھ گزری۔ اور اس کے بعد کئی شامیں انہی لوگوں کے ساتھ گزریں۔

اور اس رات جب ڈیوڈ جوزیفائن کے ساتھ تھا تو اس نے جوزیفائن سے رقص کی درخواست کی۔ دوسرے صبح جوزیفائن اس کے بازوؤں میں تھی اور وہ دونوں ہول کے ڈائننگ فلور پر رقص کر رہے تھے۔

”جوزیفائن۔“ ڈیوڈ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

”میں بھی تمہیں بہت پسند کرتی ہوں ڈیوڈ، لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“ جوزیفائن نے جواب دیا۔

”مگر کیوں؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں کلپ ڈرٹ میں نہیں رہ سکتی۔“ جوزیفائن

”ضرور“، اوئیل نے بلیو پرنٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”میں پانچ دن بعد واپس آؤں گا ڈارلنگ۔“ ڈیوڈ نے جوزیفائن سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے باپ کے ساتھ میرا انتظار کرو۔“

”میں ضرور تمہارا انتظار کروں گی۔“ جوزیفائن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈ اسی دن ٹرین کے ذریعے جوہانس برگ روانہ ہو گیا جہاں اس نے غذائی صنعت کے کئی ماہرین سے اس منصوبے کے بارے میں بات کی۔ وہ سب کے سب لوگ اس منصوبے سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ڈیوڈ کو یقین دلایا کہ یہ نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ اس میں زبردست منافع کی امید رکھنی چاہیے۔

ڈیوڈ جب کلپ ڈرفٹ واپس آیا تو اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ جوزیفائن سے شادی کا خیال اس کے لیے اتنا مسرت انگیز تھا کہ اس وقت وہ اس کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے آنے کے ساتھ ہی اوئیل اور جوزیفائن سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ وہ اس منصوبے میں شریک ہونے کے لیے تیار ہے۔

”مجھے اس جگہ سے فارغ ہونے میں دو ماہ لگیں گے۔“ ڈیوڈ نے اوئیل کو بتایا۔ ”جہاں تک سرمایہ کاری کا تعلق ہے تو میرے پاس تقریباً چالیس ہزار ڈالر میری اپنی بچت کے موجود ہیں۔ وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔“

”دس ہزار ڈالر میرے پاس موجود ہیں۔“ اوئیل نے کہا۔ ”پانچ ہزار ڈالر میں اپنے بھائی سے ادھار لے سکتا ہوں۔“

”بائی رقم ہم بینک سے قرض لے لیں گے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”اس طرح ہم اپنے کام کا آغاز کر سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اوئیل نے کہا۔ ”اب میں اور جوزیفائن سان فرانسسکو واپس جا رہے ہیں۔ ہمیں ابتدائی کام مکمل کرنا ہے۔ دو ماہ بعد ہم تمہارا انتظار کریں گے۔“ اس کے دو دن کے بعد وہ امریکا روانہ ہو گئے۔

ڈیوڈ کو کیٹ کا بے چینی سے انتظار تھا تاکہ وہ اسے یہ خبر سنا سکے۔ ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی خیال تھا کہ کیٹ اب تمہارہ جائے گی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ براڈ راجرس اس کی بددعا کے لیے یہاں موجود ہے اور اس کی موجودگی میں کیٹ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

چند روز کے بعد کیٹ واپس آ گئی۔ وہ اپنے آفس میں تھی

نے جواب دیا۔ ”اس شہر میں رہ کر تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ڈیوڈ؟ کیا تم سان فرانسسکو میں نہیں رہ سکتے؟“

”لیکن میں وہاں کیا کروں گا؟“ ڈیوڈ نے کہا۔

”ہم کل صبح ناشتے پر اس کے بارے میں بات کریں گے۔“ جوزیفائن نے کہا۔

ناشتے پر جوزیفائن اور ڈیوڈ کے علاوہ اوئیل بھی موجود تھا۔

”جوزیفائن نے مجھے کل رات تم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا ہے۔“ اوئیل نے کہا۔ ”میں سان فرانسسکو میں تمہارے قیام کی راہ نکال سکتا ہوں۔“ اور پھر اس نے اپنے برفیے کس میں سے ایک بلیو پرنٹ نکالا۔

”کیا تم نجد کھانوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ اوئیل نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”کھانوں کو نجد کرنے کا کام سب سے پہلے امریکا میں ۱۸۶۵ء میں شروع ہوا تھا۔“ اوئیل نے کہا۔ ”لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ نجد کھانوں کو دور دراز کے علاقوں تک کس طرح لے جایا جائے تاکہ وہ پھلنے نہ پائیں۔ ریلوے میں تو ریفربریٹڈ کاربن ہوتی ہیں لیکن ریفربریٹڈ ٹرکوں کا خیال ابھی تک کسی کو نہیں آیا۔ اور میں نے اس کا ایک پیٹنٹ فارمولا حاصل کر لیا ہے۔ اس سے پوری غذائی صنعت میں ایک انقلاب آ جائے گا۔“

”میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“ ڈیوڈ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہمیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو کچھ رقم بھی فراہم کر سکے اور کاروبار کو بہ خوبی چلا سکے۔“ اوئیل نے کہا۔ ”میں نے غذائی صنعت کے بڑے بڑے لوگوں سے بات کی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اگر اس کاروبار کو قائم کیا جائے تو اس میں زبردست منافع ہوگا۔“

”یعنی کا ہیڈ کوارٹر سان فرانسسکو میں ہوگا۔“ جوزیفائن نے کہا۔

”تمہارا کہنا ہے کہ تمہارے پاس اس کا ایک پیٹنٹ فارمولا موجود ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”بالکل۔“ اوئیل نے کہا۔ ”میں اس کام کو کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔“

”کیا تم بلیو پرنٹ مجھے مستعد کر سکتے ہو؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔ ”میں کسی ماہر سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

اوئیل نے اپنا پینٹنٹ فارمولہ فروخت کر دیا ہے۔ وہ کاروبار نہیں کرے گا۔“

”کیا مطلب؟“ کیٹ نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے فکا گو کی ایک کمپنی کو جانب سے دولاکھ ڈالر کی پیشکش قبول کر کے اپنا فارمولا اس کمپنی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”اوئیل نے لکھا ہے کہ مجھے جو زحمت ہوئی اس کے لیے وہ معافی کا طلب گار ہے لیکن وہ اتنی بڑی پیشکش کو ٹھکرانہیں سکتا تھا۔“

”اور جو یقائن؟“ کیٹ نے پوچھا۔ ”اس نے تو اس بات کو سخت ناپسند کیا ہوگا۔ وہ اپنے باپ سے بہت لڑی ہوگی۔“

”اوئیل اپنی بیٹی کی مرض کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا تھا۔“ ڈیوڈ نے افسردگی سے کہا۔ ”ان دونوں نے روپے کا لاٹ کیا اور میرے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ میں اب ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔“

اس بات کو چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔

ڈیوڈ اور کیٹ ریوڈی جیزرو میں تھے جہاں وہ ایک نئی کان کا جائزہ دے رہے تھے۔ وہ دونوں کھانا کھانے کے بعد اس وقت کیٹ کے کمرے میں تھے جہاں وہ کچھ اعداد و شمار کا مطالعہ کر رہے تھے۔

”بس اب بہت ہو گیا۔“ ڈیوڈ نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ”باقی کام کل ہوگا اب میں سونا چاہتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ اب تمہارا سوگ ختم ہو جانا چاہیے۔“ کیٹ نے کہا۔

”سوگ؟ کیسا سوگ؟“ ڈیوڈ نے حیرت سے کہا۔

”جو یقائن کا سوگ۔“ کیٹ نے کہا۔

”اسے میں اپنی زندگی سے نکال چکا ہوں۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”تو پھر اس کا عملی مظاہرہ بھی کرو۔“ کیٹ نے کہا اور اچانک وہ ڈیوڈ کے بالکل قریب آئی۔ ان دونوں کی سانسیں ایک دوسرے میں ملنے لگیں۔

”کیٹ۔“ ڈیوڈ نے سرگوشی میں کہا۔

اس کے دو ہفتے کے بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ مس کیٹ میک گریگاب مزنریٹ بلک ویل بن گئی۔

کلب ڈرفٹ میں منعقد ہونے والی یہ شادی کی سب سے زیادہ عظیم الشان تقریب تھی۔ شادی شہر کے سب سے بڑے چرچ میں ہوئی اور اس کے بعد نائون ہال میں استقبال دیا گیا جس میں شرکت کی دعوت عام تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کے

جب ڈیوڈ نے اسے بتایا۔ ”میں شادی کر رہا ہوں۔“

کیٹ کے اندر جیسے کوئی چیز پھٹ پڑی۔ اس کے کان سننے لگے اور آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ اپنی اس اندرونی کیفیت پر قہر پاتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک پھلکی سی مسکراہٹ کھیری اور بولی ”وہ یوں ہے؟“

”اس کا نام جو یقائن اوئیل ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”وہ یہاں اپنے باپ کے ساتھ آئی تھی جسے میں کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ ایک بہت اچھی عورت ہے۔“

”ضرور ہوگی۔“ کیٹ نے کہا۔

”ایک بات اور بھی ہے کیٹ۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”میں کروڑ بریٹ کمپنی چھوڑ رہا ہوں۔“

کیٹ کا سر چکرانے لگا۔ یہ دوسرا دھچکا تھا جو اسے لگا تھا۔

”تم کمپنی صرف اس لیے چھوڑ رہے ہو کیونکہ تم شادی کر رہے ہو؟“ کیٹ نے کہا۔ ”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”بات یہ ہے کہ کیٹ کہ جو یقائن کا باپ سان فرانسسکو میں ایک نیا کاروبار شروع کر رہا ہے۔ اسے میری ضرورت ہے۔“

”اچھا“ تو اب تم سان فرانسسکو میں رہو گے؟“ کیٹ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”لیکن تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ براڈ راجرز یہاں موجود ہے۔ وہ میرا کام یہ خوشی سنبھال لے گا۔ میرے لیے یہ فیصلہ بہت مشکل تھا۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ کیٹ نے کہا۔ ”تمہیں واقعی جو یقائن سے بہت محبت ہے۔ مجھے تم مجوزہ کاروبار کے بارے میں بتاؤ۔“

ڈیوڈ نے اسے تفصیل کے ساتھ مجوزہ کاروبار کے بارے میں بتا دیا۔

اس بات کو تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔ ڈیوڈ رات دن کمپنی کے ان کاموں میں مصروف رہتا تھا جنہیں وہ اپنے رخصت ہونے سے پہلے پہلے سنبھال دینا چاہتا تھا۔ اس دوران جو یقائن اور اوئیل کا ایک خط بھی اسے ملا تھا۔

اس دن جب ڈیوڈ کیٹ کے آفس میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ زرد تھا۔ وہ کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا بات ہے ڈیوڈ؟“ کیٹ نے پوچھا۔ ”تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“

”ہاں۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”سخت گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

پہاڑ لگے ہوئے تھے اور، دسکی شیمپین اور دیگر مشروبات کا کوئی شہر ہی نہیں تھا۔ ساری رات ہنگامہ رہا۔

”میں اب گھر جا رہی ہوں اور اپنا سامان پیک کروں گی۔“ صبحی الصبح کیٹ نے ڈیوڈ سے کہا۔ ”ایک گھنٹے بعد آکر بیٹھ لے جانا۔“

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں کیٹ اپنے وسیع و عریض مکان میں داخل ہوئی۔ جہاں وہ تنہا رہتی تھی۔ وہ میز ہیاں چڑھ کر اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ سامنے کی دیوار پر ایک بڑی سی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ کیٹ نے اس پینٹنگ کے فریم میں ایک نظر نہ آنے والا بشن دیا اور پینٹنگ ایک طرف کو سرکائی۔ دیوار میں ایک سیف نمودار ہو گیا۔ اس نے خصوصی اشاروں کی مدد سے اس سیف کو کھولا اور اس میں سے ایک معاہدے کے کاغذات نکالے۔ یہ شکاگو کی ایک کمپنی کی جانب سے اوئیل سے اس کا پینٹنگ فارمولہ دولاکھ ڈالر کے عوض خریدنے کے معاہدے کے کاغذات تھے۔

کیٹ نے معاہدے کے کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور ہولے ہوئے سرکرائے لگی۔ وہ فتح مندی کے احساس سے سرشار تھی۔ ڈیوڈ اب اس کا اپنا تھا، وہ ہمیشہ ہی اس کا اپنا تھا۔ کوئی بھی اسے اس سے چھیننے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ دونوں مل کر کروڑ کرینٹ کمپنڈ کو اور بھی زیادہ ترقی دیں گے۔ اس کی نئے سرے سے تعمیر کریں گے اور اسے دنیا کی سب سے بڑی سب سے طاقتور کمپنی بنادیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح جیسی اور مارگریٹ نے چاہا تھا۔

ڈیوڈ اور کیٹ ساری دنیا کا سفر کرتے پھرتے تھے۔ کبھی وہ پیرس میں ہوتے تو کبھی نیویارک میں، کبھی زیورن میں اور کبھی سڈنی میں۔ کمپنی کا کاروبار دور دور تک پھیل چکا تھا اور اب یہ صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی کمپنی بن چکی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔

”یہ ہمارے لیے بہترین موقع ہے۔“ کیٹ نے ڈیوڈ سے کہا۔

”کیا مطلب؟ کس قسم کا موقع؟“ ڈیوڈ نے کہا۔

”دوست ممالک کو بندو قوں اور اسلحے کی ضرورت ہے۔“ کیٹ نے کہا۔

”لیکن ہم انہیں اسلحہ فراہم نہیں کریں گے۔“ ڈیوڈ نے سختی سے کہا۔ ”ہمارا منافع ہی بہت زیادہ ہے۔ ہمیں مزید منافع کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم انسانی خون سے منافع نہیں کمانا چاہتے۔“

”لیکن ڈیوڈ، کوئی نہ کوئی تو اسلحہ تیار کرے گا ہی۔“ کیٹ نے کہا۔ ”تو پھر وہ ہم ہی کیوں نہ ہوں؟ یہ منافع کسی دوسرے کے حصے میں کیوں جائے؟“

”جب تک میں کمپنی کے ساتھ ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ ڈیوڈ نے سختی سے کہا۔ ”ہم تمہارا نہیں بنائیں گے۔“

امریکی صدر ووڈن لسن نے اعلان کیا تھا کہ امریکا جنگ میں شامل نہیں ہوگا۔ لیکن جب جرمن آبدوزوں نے غیر مسلح مسافر بردار بحری جہازوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا اور جرمن مظالم کی داستانیں عام ہونے لگیں تو صدر امریکا پر دباؤ بڑھ گیا۔

ڈیوڈ کو جہاز اڑانا آتا تھا۔ اس نے جنوبی افریقہ میں اس کی باقاعدہ تربیت لی تھی۔ اس نے کیٹ کو بتایا کہ وہ جنگ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

”یہ ناممکن ہے۔“ کیٹ نے سخت انداز میں ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہماری جنگ نہیں ہے۔“

”لیکن یہ ہماری جنگ کی شکل اختیار کر رہی ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”امریکا اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔ میں ایک امریکی ہوں۔ مجھے اپنے ملک کی مدد کرنی ہے۔“

”مگر تم چھپائیس سال کے ہو چکے ہو۔“ کیٹ نے کہا۔

”میں اب بھی جہاز اڑا سکتا ہوں۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”اور میری صحت بہت اچھی ہے۔“

کیٹ کے بہت سمجھانے بھجانے کے باوجود ڈیوڈ نہیں مانا انہوں نے آخری چند دن خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ گزارے۔ وہ اپنے اختلافات کو بھول چکے تھے۔

”تم اور براؤن جیس میرے بغیر بھی کمپنی کا کام چلا سکتے ہو۔“ ڈیوڈ نے رخصت ہوتے وقت کہا۔

”اور اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو...؟“ کیٹ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”مجھے کچھ نہیں ہوگا کیٹ۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”میں بہت سے تھنے حاصل کر کے واپس آؤں گا۔“

ڈیوڈ کی جدائی کیٹ پر بہت شاق گزری۔ اسے اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تھا تب سے وہ ڈیوڈ کو دیکھتی چلی آتی تھی۔ اور اب تو ڈیوڈ اس کا شوہر تھا اور وہ ایک ایسی مہم پر روانہ ہو گیا تھا جہاں سے اس کے زندہ واپس آنے کے بارے میں کوئی بات وفاق سے نہیں کہی جاسکتی تھی۔

بعد اچانک ڈیوڈ سے کہا۔ ”ڈارلنگ“ ہمیں کپنی کا ہیڈ کوارٹر اب بدل دینا چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“ ڈیوڈ نے چونک کر پوچھا۔

”دنیا میں آج کل سب سے بڑا کاروباری مرکز نیویارک ہے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ہماری کپنی کا ہیڈ کوارٹر ہونا چاہیے۔ جنوبی افریقہ تو ہر جگہ سے بہت دور ہے۔ اور پھر اب جب کہ نیلی فون اور تارا کا نظام موجود ہے تو ہم اپنے کسی بھی آفس سے ایک منٹ میں رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔“

”کمال ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”یہ خیال ہم لوگوں کو پہلے کیوں نہیں آیا۔“

کیٹ بلیک ویل نے نیویارک میں وال اسٹریٹ پر ایک جگہ کپنی کے ہیڈ کوارٹر کے لیے منتخب کر لی اور عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ کیٹ نے نیویارک کے ففٹھ ایویو پر ایک اور بڑی سی عمارت کی تعمیر شروع کرادی۔

نیویارک تیزی سے بڑھتا اور پھیلنا ہوا تھا۔ اس کے کاروباری مراکز کا ساری دنیا سے واسطہ تھا۔

”ڈیوڈ یہ شہر مستقبل کا شہر ہے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”یہ شہر بڑھ رہا ہے اور پھیل رہا ہے۔ اور ہم بھی اس کے ساتھ بڑھیں گے اور پھیلیں گے۔“

”میرے خدا“ کیٹ۔ ”ڈیوڈ نے کہا۔ ”تم آخر اور کیا چاہتی ہو۔“

نیویارک منتقل ہو جانے کے ایک سال بعد ایک دن کیٹ کو اپنی طبیعت بہت خراب لگی۔ ڈاکٹر بارلے جو ایک نوجوان اور ماہر ڈاکٹر تھا، ان لوگوں کا خاندانی ڈاکٹر بن گیا تھا۔ کیٹ اس کے پاس گئی اور بولی۔ ”ڈاکٹر بارلے میرے پاس بیمار ہونے کا وقت نہیں ہے۔ میں بے حد مصروف انسان ہوں۔“

چند دن بعد ڈاکٹر بارلے نے اسے اطلاع دی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

کیٹ کا جسم تیزی سے بڑھنا اور پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کے لیے آفس جانا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ ڈیوڈ اور براڈ راجرس کے اصرار پر وہ کبھی کبھی گھر پر بھی رگ جایا کرتی تھی۔ بچے کی پیدائش میں اب صرف دو ماہ باقی رہ گئے تھے کہ ڈیوڈ کو ایک کان کے معائنے کے سلسلے میں جنوبی افریقہ جانا پڑا۔ وہ ایک ہفتے کے بعد نیویارک واپس آنے والا تھا۔

کیٹ اپنے آفس میں بیٹھی ہوئی کام کر رہی تھی کہ براڈ راجرس بغیر کسی اطلاع کے اندر آ گیا۔ کیٹ اسے دیکھ کر چونک پڑی۔

جنگ کے شروع میں فرانس اور جرمنی کے پاس یورپ کی بہترین فوجیں موجود تھیں جو ہر قسم کے جنگی سپان سے نہیں گھسی ان کے مقابلے میں اتحادیوں کے پاس جنگی ساز و سامان کم تھا۔

”ان کو مدد کی ضرورت ہے۔“ کیٹ نے براڈ راجرس سے کہا۔ ”انہیں ٹینکوں، ہندوؤں اور اسلحہ کی ضرورت ہے۔“

براڈ راجرس کچھ پٹا سا گیا۔ ”کیٹ میرا خیال ہے ڈیوڈ اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ ہم۔۔۔۔۔“

”ڈیوڈ یہاں موجود نہیں ہے براڈ۔“ کیٹ نے سختی سے کہا۔ ”صرف میں اور تم موجود ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔“

کیٹ نے تقریباً نصف درجن دوست ممالک کے سربراہوں سے ملاقات کی اور ایک سال کے عرصے کے اندر کروڑوں بریٹ لپنڈ یعنی ہندو قسٹ ٹینک، ہم اور دیگر اسلحہ بنارہی تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کپنی میں ہر قسم کی جنگی ضروریات کا ساز و سامان تیار کیا جانے لگا۔ کروڑوں بریٹ لپنڈ تیزی سے دنیا کے سب سے بڑے کاروباری اداروں میں سے ایک بنی جا رہی تھی۔ منافع ناقابل یقین حد تک بڑھ گیا تھا۔ جب کیٹ نے تازہ ترین منافع کی حد دیکھی تو براڈ راجرس سے کہنے لگی۔ ”کیا تم نے یہ انداز و شمار دیکھے؟ اگر ڈیوڈ یہاں موجود ہوتا تو وہ اس بات کو تسلیم کر لیتا کہ وہ غلطی پر تھا۔“

۱۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو ایک امریکی صدر ولسن نے جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ ڈیوڈ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جنگ ختم ہو گئی۔

ڈیوڈ اب گھر واپس آ رہا تھا۔ وہ جنگ کے دوران بالکل محفوظ رہا تھا۔

ڈیوڈ کے آنے سے پہلے ہی کیٹ نے سارے گھر کو نئے سرے سے آراستہ کر دیا اور اسے اچھی طرح سجایا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ڈیوڈ جب مکان کے اندر داخل ہوا تو ہر چیز کو یا اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

”شان دارے حد خوب صورت“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ کیٹ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ کیٹ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”میرا خیال ہے کہ ہم نے طے کیا تھا کہ ہم اسلحہ نہیں بنائیں گے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”ذرا تم منافع کی شرح بھی تو دیکھو۔“ کیٹ نے کہا۔ اور ڈیوڈ خاموش ہو گیا!

اس کے کچھ دنوں کے بعد کیٹ نے ایک رات کھانے کے



”مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ جنوبی افریقہ میں ایک کان میں دھماکا ہو گیا ہے.....“ براڈ راہرس نے رک رک کر کہا۔

”کہاں؟ کس جگہ؟“ کیٹ کو اپنے پیٹ میں اچانک درد اٹھنا محسوس ہوا۔ ”کیا کوئی ہلاک بھی ہو گیا؟“

”تقریباً آدھے درجن لوگ ہلاک ہو گئے۔“ براڈ راہرس نے آہستہ سے کہا۔ ”ڈیوڈ بھی ان میں سے ایک تھا....“

کیٹ کو اپنے پیٹ کا درد تیزی سے بڑھتا ہوا محسوس ہوا اور ساتھ ہی اسے بڑے زور کا چکر آیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

اس کے ایک گھنٹے کے بعد کیٹ نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ بچے کی پیدائش دو ماہ قبل ہی ہو گئی تھی۔ کیٹ نے اس کا نام ڈیوڈ کے باپ کے نام پر اٹھوئی جنمس بلک ویل رکھا۔ ”میں تمہیں بہت سی پیار ددوں گی میرے بیٹے۔“ اس نے اپنے بچے کو چھو کر کہا۔

کیٹ فقہ اپونیو پر اپنے نئے عظیم الشان مکان میں منتقل ہو گئی جواب بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بیٹے کے علاوہ نو کڑوں کی ایک فوج تھی۔ کیٹ اپنے بیٹے کو پیار سے ٹوٹی کہتی تھی۔

۱۹۲۸ء میں جب ٹوٹی چار سال کا تھا تو کیٹ نے اسے زسری اسکول میں بھیج دیا۔ ڈارک ہاربر کے علاقے میں کیٹ کا ایک بہت بڑا مکان پہلے سے موجود تھا۔ جس کا نام سیڈار ہل ہاؤس تھا۔ دنیا کے بیشتر بڑے بڑے شہروں میں کروگر برینٹ کمپنی کے مکانات موجود تھے۔ کیٹ اپنے بیٹے کے ساتھ اکثر ڈارک ہاربر میں سیڈار ہل ہاؤس میں چلی جاتی تھی اور وہاں دونوں کا وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ ٹوٹی اب اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا اس کا وارث اس کی ساری دولت کا وارث.... اس کے بعد وہی کروگر برینٹ کمپنی کا مالک ہوگا۔

جو چیز کیٹ کو زیادہ پریشان رہتی تھی وہ تھے اس کے وطن جنوبی افریقہ کے حالات وہاں نسلی امتیاز کا مسئلہ روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ نیویارک روانہ ہونے سے کچھ عرصے پہلے کیٹ بڑی مشکل سے بانڈا سے ملاقات کر پائی تھی۔ بانڈا اب سیاہ فام تحریک مزاحمت کا ایک اہم رہنما بن چکا تھا اور حکومت کی نظروں میں ایک خطرناک آدمی تھا، اخبارات بانڈا کے تذکرے سے بھرے رہتے تھے پولیس اس کی تلاش میں رہتی تھی۔ لیکن وہ گرفتاری سے صاف بچ کر نکل جاتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں ٹوٹی کی عمر بارہ سال کی ہو گئی تھی۔ کیٹ اس کے رویہ کا بغور مشاہدہ کرتی رہتی تھی۔ وہ اسے اس کے فارغ

اوقات میں اپنے ساتھ کاروباری دوروں پر لے جاتی تھی۔ اور کیٹ یہ محسوس کرتی تھی کہ شاید وہ محض اس کا دل رکھنے کے لیے یا شاید اس کے خوف سے ان کا رو باری دوروں میں دیکھتی لے رہا ہے۔ اسے اصل دلچسپی میوزیموں اور آرٹ گیلریوں سے تھی۔ وہ مشہور عالم فن کاروں کی بنائی ہوئی تصویروں اور مجسموں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہ کر انہیں نثر لپٹی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ گھر پر بھی وہ ان تصاویر کی نقل بنانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس بات کا خیال رکھتا کہ اس کی ماں کو اس کا پتا نہ چلنے پائے۔

کچھ دنوں کے بعد کیٹ نے ٹوٹی کو تعلیم کی غرض سے سویٹزرلینڈ کے ایک اسکول میں بھیج دیا۔

کمپنی بڑھتی اور پھیلتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ کیٹ خیراتی ادارے قائم کرتی رہی جن سے کالجوں، چرچوں اور اسکولوں کو امداد دی جاتی تھی۔ وہ اپنے آرٹ کے ذخیرے میں بھی اضافہ کرتی جا رہی تھی۔

تغیلات کے دنوں میں جب ٹوٹی گھر آیا تو ایک دن اس کی ماں نے دوران گفتگو اس سے کہا۔ ”کروگر برینٹ لمیٹڈ کمپنی ایک دن تمہاری ملکیت ہو گئی ٹوٹی، تم اس کے واحد مالک ہو گے اور اسے چلاؤ گے....“

”میں اسے نہیں چلانا چاہتا مامی۔“ ٹوٹی نے لڑکھاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں دولت اور اقتدار سے دل چسپی نہیں رکھتا۔“

اور کیٹ اس پر جیسے چھٹ پڑی۔ ”تم احمق لڑکے.... تم کاروبار اور اقتدار کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں دنیا میں برائی پھیلا رہی ہوں؟ لوگوں کو نقصان پہنچا رہی ہوں؟“ اچانک اسے اپنے لہجے کی کڑی کا احساس ہوا اور وہ سنبھل گئی۔ ”مجھے کی کوشش کرو بیٹے۔“ اس نے کہا۔ ”ہم ہزاروں لاکھوں ان لوگوں کو روزگار فراہم کرتے ہیں۔ جب ہم کسی پیمانہ علاقے میں ایک فیملی قائم کرتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کو روزگار ملتا ہے، علاقے میں اسکول کھلتے ہیں، بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہم بھوکے لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اب بھی یہ نہ سوچنا کہ کاروبار یا اقتدار بڑی چیزیں ہیں۔“

”میں معافی چاہتا ہوں مامی۔“ ٹوٹی نے آہستہ سے کہا۔ ”میں تو ایک فن کار بنوں گا۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ کیٹ کے سامنے کھل کر اپنی خواہش کا اظہار کر سکتا۔ کیٹ کی بھاری ہجر کم اور غالب شخصیت

”ہاں مہی میرا یہی مطلب ہے۔“ ٹونی نے کہا۔ ”مصور ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں مجھے سب سے زیادہ دل چسپی ہے۔“

کیٹ کو اس ہوا کے اسرار سے شکست ہو رہی ہے، لیکن اس نے زندگی میں بھی شکست قبول نہیں کی تھی۔ ”بے شک اسے حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارے۔“ کیٹ نے سوچا۔ ”لیکن میں اسے اس طرح اپنی زندگی برباد کرنے کی بھی تو اجازت نہیں دے سکتی۔“

”میں جانتی ہوں کہ تم وارن اسکول آف فنانس اینڈ کامرس میں داخلہ لے لو۔“ کیٹ نے کہا۔ ”اور اس کے دو سال بعد بھی اگر تم مصور بننا چاہو تو میں تمہیں خوشی سے اس کی اجازت دوں گی۔“

کیٹ کو یقین تھا کہ اس عرصے میں ٹونی اپنا ارادہ بدل دے گا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل تصور تھی کہ اس کا بیٹا لامحدود دولت کا وارث اپنی زندگی رنگوں، برش اور کیوس کے ساتھ گزارے اور کاروبار کی دیکھ بھال نہ کرے۔“

اس اثناء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور کروگر بریٹ لینڈ کمپنی کے منافع آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ کیٹ نے اسلحہ اور جنگی ساز و سامان کی تیاری اور فراہمی سے بے پناہ دولت کمائی۔ کمپنی کی فیکٹریاں چوبیس گھنٹے کام کر رہی تھیں۔

دو سال کے خاتمے کے بعد ٹونی نے اسکول چھوڑ دیا۔ اس نے کیٹ کے آفس میں جاکر اسے بتایا۔ ”میں تھک گیا ہوں مہی میں نے بہت کوشش کی، لیکن میرا اصل میدان مصوری ہے۔ میں مصوری کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جب جنگ ختم ہو جائے گی تو میں پیرس چلا جاؤں گا۔“

کیٹ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر سختی کے آثار تھے۔

”مجھے اس کا احساس ہے مہی کہ تم یہ بات پسند نہیں کرو گے۔“ ٹونی نے کہا۔ ”لیکن میں اپنے طور پر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ تم نے جو کچھ کہا۔ وہ میں نے کیا۔ اور اب تم مجھے میری مرضی کے کام کا موقع دو۔ مجھے شکاگو کے آرٹ اسکول میں داخلے کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔“

۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان کے بمباریروں نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ اور امریکا بھی جنگ میں شامل ہو گیا۔ اسی سہ پہر کو ٹونی امریکا کی بحریہ میں بھرتی ہو گیا۔ اسے تربیت کے لیے ورجینا بھیج دیا گیا اور وہاں سے جنوبی بحرالکاہل روانہ کر دیا گیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کو جنگ مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ اور ٹونی گھر

نے ٹونی کی اپنی شخصیت کو بری طرح کھل اٹھا۔ ٹونی ایک قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے سامنے اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پاتا تھا اور باساقات اس کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے اس کی زبان بھی لڑکھڑا جاتی تھی۔ ٹونی کی شخصیت مسخ ہوئی چارہری تھی۔

کیٹ جو کچھ ٹونی سے چاہتی تھی ٹونی اس کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا تھا۔ وہ آرٹ اداروں کی دنیا میں خود کو گم کر دینا چاہتا تھا۔ اور کیٹ اسے ایک کامیاب اور با اقتدار کاروباری انسان بنانا چاہتی تھی۔ ٹونی شدید کشمکش میں مبتلا رہتا تھا۔

جب ٹونی پندرہ برس کا ہوا تو اس سال اس کی ماں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی موسم گرما کی تعطیلات جنوبی افریقہ میں گزارے۔

”میں اس سال اپنی تعطیلات ڈارک ہاربر میں گزارنا چاہتا ہوں۔“ ٹونی نے اپنی ماں سے کہا۔

”اگلے سال ٹونی۔“ کیٹ نے کہا۔ ”میں اس سال تمہیں جو ہانس برگ بھیجنا چاہتی ہوں۔“ ٹونی خاموش ہو گیا۔

کیٹ نے ٹونی کے سفر کا یہ بخوبی انتظام کیا اور جو ہانس برگ میں اپنے منبر کو اس سلسلے میں مفصل ہدایات دیں۔ وہ روزانہ فون کر کے اس سے ٹونی کے بارے میں معلوم کرتی تھی۔ ٹونی وہاں خوب سیر و تفریح کر رہا تھا۔

جب ٹونی واپس آیا تو اس نے اپنی ماں سے کہا۔ ”جانتی ہو مہی مجھے وہاں سب سے زیادہ کیا چیز اچھی لگی؟ رنگ! وہ طرح طرح کے رنگوں کی سرزمین ہے۔ میں نے وہاں بہت ساری تصاویر بنائیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں دوبارہ وہاں واپس چلا جاؤں۔ اور خوب تصویریں بناؤں۔“

”خالی وقت تصویریں بنانا ایک اچھا مشغلہ ہے۔“ کیٹ نے بڑی احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں مہی یہ خالی وقت کا مشغلہ نہیں ہے۔“ ٹونی نے مجبوری سے کہا۔ ”میں مصوری بننا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ میں مصوری کی تعلیم کے لیے پیرس جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اندر ایک مصور بننے کی صلاحیت موجود ہے۔“

کیٹ کے اعصاب تن گئے۔ یہ لڑکا کس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔

”تم کیا اپنی ساری زندگی تصویریں بناتے ہوئے گزارنا چاہتے ہو؟“ کیٹ نے کہا۔ ”یقیناً تمہارا یہ مطلب نہیں ہوگا۔“

دوران ان لوگوں کو صرف اسلحہ بنانے تھے اور دوسرے سال کے دوران زندہ ڈنوں کی تصویریں بناتی تھیں۔

ٹوٹی نے پہلا سال کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا۔ ٹوٹی سمیت صرف اٹھ طلباء ایسے تھے جنہیں اگلے درجے میں ترقی دی گئی۔ ٹوٹی کے ساتھ کے طلباء بیشتر غریب اور متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور وہ ٹوٹی کو بھی اپنا ہی جیسا سمجھتے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ٹوٹی کسی ارب پتی ماں کا بیٹا ہے۔ ٹوٹی کا فلیٹ اس کے دوسرے ساتھیوں کی رہائش گاہوں کی ہی طرح تھا۔ ٹوٹی اپنے ساتھیوں میں اچھی طرح کھل مل گیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جاتا۔ میوزیموں اور آرٹ گیلریوں کی سیر کرتا اور وہ گھنٹوں ایک تصویر کے فنی نکات کے بارے میں آپس میں بحث کرتے۔

کیٹ نے پیرس آ کر جب پہلی بار ٹوٹی کا فلیٹ دیکھا تو وہ مستحضر رہ گئی۔ افسوس کہ اس جیسے دان میں رہ رہا ہے اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے مسکراتے ہوئے ٹوٹی سے کہا۔ ”اچھی جگہ ہے بیٹے۔ مگر ذرا چھوٹی ہے۔“

”مجھے رتنا بھی کیا ہے مگر!“ ٹوٹی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں یہاں اکیلا ہی تو رہتا ہوں۔“

”اچھا مجھے اب اپنی تصویروں کے بارے میں بتاؤ۔“ کیٹ نے کہا۔ اور ٹوٹی نے اسے اپنی تصویر کے بارے میں بتایا۔ اس مرتبہ کیٹ نے اس سے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ وہ مصوری چھوڑ کر کاروبار میں آ جائے۔

اب ٹوٹی نے زندہ ماڈلوں کی تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ تقریباً ہر افراد ایسے تھے جو اسکول میں اپنے آپ کو ماڈلنگ کے لیے پیش کرتے تھے۔ اور انہی میں ایک ڈومینیک بھی تھی۔ وہ ایک بہت خوب صورت نوجوان لڑکی تھی جس کی آنکھیں گہری بنہ تھیں۔ ڈومینیک بعض مشہور عالم مصوروں کے لیے بھی ماڈل کا کام کرتی تھی۔ تمام لوگ اسے بے حد پسند کرتے تھے کلاس ختم ہونے کے بعد تقریباً روزانہ ہی لڑکے اس کے گرد اکٹھا ہو جاتے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے لیکن ڈومینیک اسکول کے کسی بھی طالب علم کے ساتھ کبھی باہر نہیں جاتی تھی۔

ایک سہ پہر کو جب سارے طالب علم اپنا کام ختم کر چکے تھے ٹوٹی ڈومینیک کی ایک تصویر پر کام میں مصروف تھا کہ اچانک ڈومینیک چیخے آ گئی۔

”میری ناگ بہت لمبی ہے۔“ ڈومینیک نے کہا۔

واپس آ گیا۔ کیٹ کو اس سارے عرصے کے دوران اس کے خطوط برابر ملتے رہے تھے۔

کیٹ کا خیال تھا کہ بھرپور عملی زندگی کے ان برسوں کے دوران ٹوٹی بدل گیا ہوگا اور اس کے دماغ سے مصور بننے کا خیال نکل گیا ہوگا۔ اور اس نے کبھی اور کاروبار کی اہمیت و محسوس کر لیا ہوگا۔ ٹوٹی کی شکل و صورت میں بھی اس عرصے میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش سخت ہو گئے تھے اور آنکھیں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔

”اب تمہارا کیا منصوبہ ہے بیٹے؟“ کیٹ نے بڑی امیدوں کے ساتھ ٹوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا میں مصوری کی تعلیم کے لیے پیرس جانا چاہتا ہوں۔“ ٹوٹی نے جواب دیا۔ کیٹ خاموش ہو گئی۔

ٹوٹی اس سے پہلے بھی پیرس آ چکا تھا، لیکن اس بار صورت حال مختلف تھی۔ جرمینوں کے حملوں کے باعث پیرس کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ ٹوٹی اب یہاں رہنے کی غرض سے آیا تھا ایک سیاح کی حیثیت سے نہیں۔ پیرس میں کیٹ کا ایک عالی شان مکان موجود تھا اور ٹوٹی چاہتا تو اس میں رہ سکتا تھا، لیکن وہ اپنے طور پر زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک الگ اپارٹمنٹ لے کر رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک بہت مختصر سافلیٹ تھا جو ایک لیوٹگ روم، ایک بیڈ روم اور ایک چھوٹے سے باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ بیڈ روم اور بچن کے درمیان ایک چھوٹا سا باتھ روم تھا۔

اس کے بعد کسی آرٹ اسکول میں داخلہ لینے کا مسئلہ تھا۔ ٹوٹی نے اکیول آرٹس اسکول میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا جس کا شمار فرانس کے سب سے بڑے آرٹ اسکول میں ہوتا تھا۔ اس اسکول میں داخلہ امیدوار کی صلاحیت سے مطمئن ہونے کے بعد ہی ملتا تھا۔ ٹوٹی نے داخلے کی درخواست کے ساتھ اپنی تین تصاویر بھی پیش کیں۔ چار ہفتے کے بعد اسے دوبارہ اسکول میں بلا گیا۔

”تمہاری تصویروں میں جان ہے۔“ اسے بتایا گیا۔ ”ہماری کمپنی نے تمہیں داخلے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔“

ٹوٹی کو بتایا گیا کہ تعلیم کی مدت پانچ سال ہوگی اگلی کلاس میں داخلہ صرف اسی وقت مل سکے گا جب اس کے اساتذہ اس کے کام سے مطمئن ہوں۔

کلاس میں پچیس لڑکے تھے، ان میں زیادہ تر فرانسیزی تھے۔ ٹوٹی نے پچیس ہی دن سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پہلے سال کے

لرہا ہے۔ وہ اسے فروغ دے کر اور زیادہ سے زیادہ پختہ بنانے کا۔ وہ اسکول کے علاوہ آزادانہ طور پر تقریباً دو درجن مختلف اقسام کی تصاویر بنا چکا تھا۔

پہلوؤں کے بعد ڈومینیک نے اسے مشورہ دیا کہ اس کی تصاویر کی نمائش ہونی چاہیے۔ لیکن ٹونی نے کہا وہ ابھی خود کو اس لائق نہیں سمجھتا۔

”تمہارا خیال غلط ہے ٹونی۔“ ڈومینیک نے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ تمہاری تصاویر اس قابل ہیں کہ ان کی نمائش کی جانی چاہیے۔ یہ نمائش ضرور ہوگی۔“

اس سے اگلے دن جب ٹونی گھر آیا تو اس نے ڈومینیک کے ساتھ ایک موٹے سے عمر رسیدہ آدمی کو دیکھا۔ ٹونی اسے جانتا تھا۔ اس کا نام انٹون جارج تھا۔ وہ ایک درمیانے درجے کی آرٹ گیلری کا مالک تھا۔ سارے کمرے میں ٹونی کی تصاویر پھیلی ہوئی تھیں۔

”کیا یہ ہو رہا ہے؟“ ٹونی نے حیرانی سے پوچھا۔  
”میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا کام بہت شان دار ہے۔“ انٹون جارج نے کہا۔ ”میں اپنی گیلری میں تمہاری تصاویر کی نمائش کر کے فخر محسوس کروں گا۔“

”جانتا نہیں۔“ ٹونی نے کہا۔  
اگلے چند دن بعد ٹونی کی تصاویر کی نمائش ہونے والی تھی۔ نمائش سے دو دن پہلے کیٹ اچانک بیس آگئی۔ جب وہ ٹونی کے فلیٹ پر پہنچی تو ٹونی نے اس کا ڈومینیک سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد کیٹ ٹونی کی تصاویر دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے تمہاری تصویروں کی نمائش ہونی چاہیے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”میں اس کا بندوبست کروں گی۔“

”شکریہ می!“ ٹونی نے کہا اور اسے دو دن بعد ہونے والی اپنی تصاویر کی نمائش کے بارے میں بتایا۔ کیٹ نے بہت مسرت کا اظہار کیا۔  
”یہ ضروری ہے کہ صحیح قسم کے لوگ اس نمائش کو دیکھیں۔“ کیٹ نے کہا۔

”صحیح قسم کے لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے می؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے فن کی پرکھ رکھنے والے لوگ۔ دانش ور فن کے ناقدین۔ مثلاً آندرے یوساؤ۔۔۔۔۔ آندرے یوساؤ کا وہاں ہونا چاہیے۔“

آندرے یوساؤ کا شمار فرانس کے ممتاز نقادان فن میں ہوتا تھا۔ مصوری کے بارے میں اس کی رائے بہت اہم سمجھی جاتی

”اوہ۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے۔“ ٹونی نے جلدی سے کہا۔ ”میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔“

”نہیں۔“ تصویر میں تو ناک بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ ایک بار بٹے ہوئے کہا۔ ”یہ تو میری اپنی ناک ہے جو بہت لمبی ہے۔“  
”مجھے تمہاری ناک بہت پسند ہے۔“ ٹونی نے کہا۔

”تم نے مجھے بھی اپنے ساتھ باہر چلنے کی دعوت نہیں دی۔“ اچانک ڈومینیک نے کہا۔ اور ٹونی حیران رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈومینیک اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی باہر نہیں جاتی۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ سب لوگ ہی ہمیں دعوت دیتے ہیں۔“ ٹونی نے کہا۔ ”اور تم ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں جاتی۔“

”لیکن میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔“ ڈومینیک نے کہا۔  
اور اس شام کو ٹونی جب ڈومینیک کو اپنے فلیٹ پر لے آیا تو ڈومینیک نے فلیٹ میں چاروں طرف نظر ڈالی اور بولی۔

”تمہارے فلیٹ کی صفائی کون کرتا ہے؟“  
”مجھے۔ میں ایک بار ایک عورت آتی ہے اور وہ صفائی کرتی ہے۔“ ٹونی نے جواب دیا۔

”وہ ٹھیک سے کام نہیں کرتی۔“ ڈومینیک نے کہا۔ ”یہ جگہ بہت گندی ہے۔“

ڈومینیک نے ایک بالٹی پانی صابن اور کپڑا لیا اور فلیٹ کی صفائی میں لگ گئی۔ اس نے فلیٹ کو آئینے کی طرح چمکا کر رکھ دیا اور اس کے بعد وہ نہانے کے لیے چلی گئی۔ جب وہ نہا کر نکلی تو سیدھی ٹونی کے بازوؤں میں چلی گئی۔

اس دن کے بعد سے ٹونی اور ڈومینیک کے تعلقات برابر استوار ہوتے گئے۔ کبھی کبھی ٹونی ڈومینیک کے بارے میں سوچتا تھا اور اسے تعجب ہوتا تھا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو اس سے کچھ طلب نہیں کرتی اور اس کے لیے اتنا کچھ کرتی ہے۔ وہ اب تقریباً روزانہ شام کو اس کے گھر آتی۔ اس کے لیے کھانا پکاتی اور اس کے گھر کی صفائی سنبھالتی کرتی۔ اور جب ٹونی اسے اپنے ساتھ باہر لے جاتا تو ڈومینیک کا اصرار ہوتا کہ وہ اس پر زیادہ پیسے خرچ نہ کرے۔

ڈومینیک نے ٹونی کو پیشکش کی کہ وہ اس کے فلیٹ میں منتقل ہو جائے جو زیادہ بڑا اور آرام دہ ہے۔ لیکن ٹونی نے انکار کر دیا۔ اس کے چند روز کے بعد ڈومینیک خود ٹونی کے فلیٹ میں منتقل ہو گئی اور وہیں رہنے لگی۔

ٹونی کا اپنی فنی کاوشوں پر اور اپنی ذات پر اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے اپنی اصل صلاحیت کو دریافت

چاہتا ہوں۔“  
”یہ ہوئی بلیک ویل۔“ جارج نے ٹوٹی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

آندرے یوساؤ کچھ دیر تک گیلری میں رہا۔ اس نے تمام تصاویر کو غور سے دیکھا۔ اور جب وہ جانے لگا تو اس نے ٹوٹی سے مخاطب ہو کر صرف ایک جملہ کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں یہاں آیا ہوں۔“

آندرے یوساؤ کے جانے کے چند منٹ کے اندر اندر ٹوٹی کی ساری تصاویر فروخت ہو گئیں۔ ایک نیا فن کار ابھر رہا تھا۔  
”آندرے یوساؤ اور میری گیلری میں؟“ انٹون جارج جوش مسرت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ناممکن ممکن ہو گیا ہے۔“

اگلی صبح پانچ بجے ٹوٹی اور ڈومینیک اٹھ کر صبح کا اخبار خریدنے کے لیے بھاگے۔ اخبار اسی وقت آیا تھا۔ ٹوٹی نے جلدی سے اخبار لیا اور صفحات پلٹ کر اس کا آرٹ سیکشن نکالا۔ ٹوٹی کی تصاویر پر تبصرہ نمایاں طور پر شائع ہوا تھا۔ تبصرہ نگار آندرے یوساؤ تھا۔ ٹوٹی اسے جلدی جلدی بہ آواز بلند پڑھنے لگا۔

”گزشتہ رات ایک نوجوان امریکی مصور انٹونی بلیک ویل کی تصاویر کی نمائش جارج آرٹ گیلری میں منعقد ہوئی۔ میرے لیے یہ ایک اچھا شجرہ تھا۔ میں نے باصلاحیت فن کاروں کی تصاویر کی اتنی نمائش میں شرکت کی ہے کہ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ بڑی تصویریں کیسی ہوتی ہیں۔ اور یہ مجھے کل رات ہی یاد آیا۔“

ٹوٹی کا چہرہ خاک جیسا ہو گیا۔  
”آگے مت پڑھو۔“ ڈومینیک نے ٹوٹی سے اخبار چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
”نہیں۔“ ٹوٹی نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”مجھے سارا پڑھنا ہے۔“

”میں نے پہلے تو یہ سمجھا تھا شاید یہ سب کچھ ایک مذاق ہے۔ میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص ایسی بچکانہ تصاویر کو ایک آرٹ گیلری میں لٹکانے کی جسارت بھی کرے گا اور انہیں فن کا نام دے گا۔ میں نے ان تصاویر میں صلاحیت کا شائبہ بھی نہ پایا۔ ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ تصویروں کو لٹکانے کے بجائے مصور کو لٹکا دیتے۔“

ٹوٹی کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا اس کے سینے میں پگھلا ہوا سیسہ بھر گیا ہے۔ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔

تھی لیکن وہ صرف بڑی بڑی نمائشوں میں شرکت کرتا تھا اور اخبارات میں تصویروں کے بارے میں اس کے کچھ ہونے کا لم حرف آخر کا ذکر کرتے تھے۔

”بھلا آندرے یوساؤ اس چھوٹی سی اور غیر اہم نمائش میں کیوں آئے گا؟“ ٹوٹی نے کہا۔ ”وہ تو صرف بڑی بڑی آرٹ گیلریوں میں جاتا ہے۔“

”نہیں اسے ضرور آنا چاہیے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”وہ تمہیں راتوں رات مشہور بنا سکتا ہے۔“

”لیکن ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ آندرے یوساؤ اس نمائش میں آئے گا۔“ ٹوٹی نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میرے کچھ دوست ہیں جو اسے جانتے ہیں۔“ کیٹ نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گی۔“

”یہ بہت بڑی بات ہوگی۔“ ڈومینیک نے کہا۔ ”اگر وہ نمائش میں آیا تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔“

”میں جھٹکتی ہوں کہ آندرے یوساؤ تمہاری تصاویر کو پسند کرے گا۔“ کیٹ نے کہا۔ ”میں اس کے ذوق سے واقف ہوں۔“

اس رات کیٹ نے ٹوٹی اور ڈومینیک کو کھانے پر مدعو کیا۔ ٹوٹی نے اس سے درخواست کی کہ وہ نمائش تک رک جائے۔ لیکن کیٹ نے اسے بتایا کہ اسے کل ہی واپس روانہ ہونا ہے۔ کیونکہ اسے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا ہے۔  
اگلی صبح کیٹ نے ایئر پورٹ سے ٹون کر کے ٹوٹی کو بتایا کہ وہ کوشش کے باوجود آندرے یوساؤ سے رابطہ قائم نہیں کر سکی ہے۔ اس نے ٹوٹی کی نمائش کی کامیابی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

جارج آرٹ گیلری کوئی بہت زیادہ بڑی آرٹ گیلری نہیں تھی۔ اس کے مختصر سے ہال میں دیواروں پر ٹوٹی کی دو درجن تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ لوگوں کی اچھی سی تعداد وہاں موجود تھی۔ ٹوٹی خاصا نرس ہو رہا تھا۔

اور تب اچانک ساری آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ انٹون جارج تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

آندرے یوساؤ گیلری میں داخل ہو رہا تھا۔ ٹوٹی کے ہاتھ آہستہ آہستہ کانپنے لگے۔

”موہیبو یوساؤ۔“ انٹون جارج نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”تمہارا آہم سب کے لیے اعزاز کی بات ہے۔“

”شکریہ۔“ آندرے یوساؤ نے کہا۔ ”میں آرٹسٹ سے ملنا

”مجھے اس پر یقین نہیں آتا۔“ ڈومینیک نے رہائی آواز میں کہا۔ ”وہ سورا... جھوٹا۔“

”وہ فن کا ناقد ہے۔“ ٹونی نے آہستہ سے کہا۔ ”اس نے دیکھا، سمجھا اور لکھ دیا۔“ ان خدا یائیں بھی کتنا متفق تھا۔

ٹونی کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ اب چند گھنٹوں کے اندر اندر سارا پیرس اس تہرے کو پڑھ لے گا۔ وہ تصحیک و تفسیر کا نشانہ بن جائے گا! لیکن جو تیز ٹونی کو سب سے زیادہ تکلیف دے رہی تھی۔ وہ یہ بھی کہ اس نے اپنے آپ کو غلط سمجھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک اچھا مصور بن سکتا ہے۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر مصور بننے کی قطعاً کوئی صلاحیت موجود نہیں تھی۔

وہ سارا دن اور رات کا بیشتر حصہ ٹونی نے شراب پیتے ہوئے گزارا۔ جب وہ رات گئے گھر واپس آیا تو ڈومینیک نے بتایا کہ اس کی ماں کی بارفون کر چکی ہے۔

”کیا تم نے اسے تہرہ پڑھ کر سنا دیا ہے؟“ ٹونی نے پوچھا۔ ”ہاں۔“ ڈومینیک نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ اصرار کر رہی تھی۔“

اس دوران فون کی گھنٹی پھر بجی۔ ٹونی نے فون اٹھالیا۔ ”ٹونی ڈیر!“ کیٹ نے کہا۔ ”میری بات سنو میں اس سے کہوں گی کہ وہ اس کی تردید چھاپے۔“

”نہیں مُمی!“ ٹونی نے کہا۔ ”یہ ٹونی کا رہا رہی لین دین نہیں ہے۔ یہ ایک نقاد کا اظہار رائے ہے۔ اس کی رائے یہ ہے کہ مجھے بھائی پر لوکا دیا جانا چاہیے۔“

”ڈارلنگ مجھے سخت افسوس ہے کہ تمہیں اتنا دکھ پہنچا۔“

”نہیں ہے مُمی!“ ٹونی نے کہا۔ ”میں آندرے یوساؤ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے مزید مدد دینا یا کرنے سے بچا دیا۔“

”میرا انتظار کرنا ڈارلنگ!“ کیٹ نے کہا۔ ”میں اس وقت جو باس برگ میں ہوں۔ کل میں وہاں سے روانہ ہو جاؤں گی اور پیرس آؤں گی۔ پھر ہم ساتھ ساتھ نیویارک چلیں گے۔“

”نہیں ہے مُمی!“ ٹونی نے کہا اور ریسپورڈ کھ دیا۔

”مجھے افسوس ہے ڈومینیک کہ تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا۔“ ٹونی نے ڈومینیک سے کہا۔ ڈومینیک کی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے تھے۔

اس سے اگلے دن شام کو پیرس میں کروگر بریٹ لمیٹڈ کمپنی کے علاقائی دفتر میں کیٹ بلک ویل اپنے شاندار کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک چپک لکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص آندرے یوساؤ تھا۔

”یہ واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔ مسز بلک ویل آندرے یوساؤ کہہ رہا تھا۔“ وہ تہارے بیٹے میں واقعی بڑا صلاحیت موجد ہے۔ وہ ایک بڑا فن کار بن سکتا تھا۔“

کیٹ نے سر و نظروں سے آندرے یوساؤ کی طرف دیکھ کر ”مسٹر یوساؤ دنیا میں ہزاروں مصور موجود ہیں۔ میرا بیٹا! جو ہم کا حصہ نہیں بن سکتا تھا پھر اس نے چپک آندرے یوساؤ طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنا کام کر دیا۔ اب اپنا کام کر رہی ہوں۔ کروگر بریٹ لمیٹڈ کمپنی جو ہانس برگ میں لندن اور نیویارک میں آرٹ میوزیم قائم کرے گی اور تصاویر کے انتخاب کے انتظام کرے گا۔“

آندرے یوساؤ کے جانے کے بعد کافی دیر تک کیٹ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ بہت افسردہ تھی۔ اسے اپنے بیٹے بہت محبت تھی۔ اگر اسے بھی چتا چل گیا تو...؟ اس نے بہت خطرہ محسوس کیا تھا، لیکن وہ ٹونی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اپنی زندگی ان کاموں میں ضائع کرے۔ اُم کام تو کمپنی کا تحفظ کرنا تھا۔ کمپنی جس کے لیے کیٹ نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر رکھا تھا۔

کیٹ اپنی جگہ سے اٹھی۔ وہ خود کو بہت تھکا ہوا پارسی تھوڑا اب اسے ٹونی کو ساتھ لے کر نیویارک روانہ ہو جانا تھا۔

اگلے چند سال ٹونی نے اس طرح گزارتے گویا وہ اب بندگی میں سفر کر رہا ہو۔ اس کی زندگی کے قسم کے جوش و جذبہ سے بھر خالی تھی۔ بڑی محنت کے ساتھ کروگر بریٹ کمپنی غیر دل چسپ اور اتنا دینے والے کاموں میں مصروف رہتا اور ماضی کی ساری باتوں کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اس ڈومینیک کوئی خط لکھے لیکن وہ واپس آئے۔ ڈومینیک کا وہ نہ تھا۔ ٹونی کی زندگی میں اب خلا تھا صرف خلا۔ وہ ایک جان دشمن کی طرح کام کرتا رہتا تھا۔

اور پھر ایک دن ٹونی نے ایک رسالے میں ایک اشتہر دیکھا۔ اس اشتہار میں ماؤل کے طور پر جس لڑکی کی تصویر تھی ڈومینیک بھی۔ یہ ایک امریکی رسالہ تھا۔

جس کمپنی کا وہ اشتہار تھا ٹونی نے وہاں فون کیلے اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا پتا معلوم کیا۔ اس کا نام بیلینگ ایجنسی تھا۔ ٹونی نے بیلینگ ایجنسی کو فون کیا۔

”میں تمہاری ایک ماؤل ڈومینیک میسن کا پتا معلوم کرنا چاہوں۔“ ٹونی نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ہمارا پالیسی کے مطابق اپنی کسی ماؤل کے بارے میں

اطلاعات نہیں فراہم کر سکتے۔“

ٹونی کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر براڈ راجرز کے پاس چلا گیا۔

”براڈ“ کیا تم بلینگ ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ ٹونی نے اس سے پوچھا۔

”کیوں نہیں؟“ براڈ نے کہا۔ ”یہ ہماری ذیلی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔“ براڈ نے کہا۔

”ہم نے اسے کب حاصل کیا؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”چند سال پہلے۔“ براڈ نے جواب دیا۔ ”تقریباً اس وقت جب سے تم نے کمپنی میں کام کرنا شروع کیا ہے۔ تمہیں اس سے کیا دل چسپی پیدا ہو گئی ہے؟“

”میں اس کی ایک ماڈل کا پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ ٹونی نے کہا۔

”کیوں سا مسئلہ ہے؟ ابھی لو۔“ براڈ راجرز نے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں براڈ۔“ ٹونی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”میں خود معلوم کر لوں گا۔“

اسی سہ پہر کو ٹونی بلینگ ایجنسی کے صدر دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔

”مسٹر بلیک ویل، تمہارا یہاں آنا ہم سب کے لیے اعزاز کی بات ہے۔“ صدر منٹن کرکھارہ تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا ہے۔ گزشتہ سہ ماہی کے دوران ہمارا منافع...“

”میں منافع کے بارے میں معلوم کرنے نہیں آیا ہوں۔“ ٹونی نے کہا۔

”نہجے تمہاری ایک ماڈل ڈومینک میسن کا پتا چاہیے۔“

”اوہ ضرور۔“ صدر نے کہا۔ ”تمہاری ماں نے اپنی خصوصی ہدایت کے تحت اسے یہاں ملازم رکھوا ہوا تھا۔“

ٹونی ڈومینک کے ایڈورٹائزنگ کے بارے میں انتظار کر رہا تھا کہ ایک سیاہ سیڈان آکر رکری اور ڈومینک اس میں سے باہر نکلی۔ اس کے ساتھ ایک مضبوط جسم کا ٹو جوائن آدی بھی تھا۔

ٹونی کو دیکھتے ہی ڈومینک جیسے زمین میں جم کر رہ گئی۔

”میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں ڈومینک۔“ ٹونی نے کہا۔

”پھر کسی وقت۔“ ڈومینک کے ساتھ موجود ٹو جوائن نے کہا۔ ”ہم لوگ اس وقت بہت جلدی میں ہیں۔“

”اپنے دوست سے کہو کہ چلا جائے۔“ ٹونی نے ڈومینک سے کہا۔

”میں پلیز چپے جاؤ۔“ ڈومینک نے اسے سناٹھی سے کہا۔ وہ خاصی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ ”میں تمہیں شام کو فون کروں گی۔“ وہ شخص ٹونی کو گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس کے بعد ڈومینک ٹونی کو اپنے ایڈورٹائزنگ میں لے آئی۔ ڈومینک کے ایڈورٹائزنگ سے اس کی خوشحالی کا اندازہ ہوتا تھا۔

”تم نے بلینگ ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کس طرح حاصل کی؟“ ٹونی نے پوچھا۔ اس کا لہجہ سرد تھا۔

”وہ۔ میں تمہارے جانے کے بعد امریکا آ گئی تھی۔“ ڈومینک نے کہا۔ ”یہاں میں نے اس کمپنی کا اشتہار برائے ملازمت پڑھا اور درخواست دے دی۔“

”میری ماں سے تمہاری پہلی ملاقات سب ہوئی تھی؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”تمہارے فلیٹ میں... جیس میں...“ ڈومینک نے کہا۔

”زیادہ کھیل کھیلنے کی ضرورت نہیں ہے ڈومینک۔“ ٹونی نے کہا۔ ”کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے لیکن اب اگر تم ایک لفظ بھی جھوٹ بولیں تو میں تمہارا چہرہ اتنا بگاڑوں گا کہ اس کی کوئی تصویر نہیں بن سکے گی۔“

ڈومینک خوف زدہ ہو کر ٹونی کو دیکھنے لگی۔ ٹونی نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ ”تمہاں سے پہلی بار کب ملی تھیں؟“

”جب تمہیں پیرس کے ایکول آئرس سکول میں داخلہ ملا تھا۔“ ڈومینک نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہاری ماں نے جی وہاں میرے لیے ماڈلنگ کرنے کا بندوبست کیا تھا۔“

”اور اس نے تمہیں میرے پیچھے لگا پایا؟“ ٹونی نے کہا۔ ”اور تم نے یہ ظاہر کیا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ اور اس کے عوض اس نے تمہیں رقم دی؟“

”ہاں۔“ ڈومینک نے جواب دیا۔ ”میرے حالات بہت خراب تھے میرے پاس بالکل رقم نہیں تھی۔“

”میری ماں کیا چاہتی تھی؟“ ٹونی نے پوچھا۔

”وہ تم پر نظر رکھنا چاہتی تھی۔“ ڈومینک نے آہستہ سے جواب دیا۔

ٹونی جب وہاں سے واپس آیا تو شرم اور ذلت کے شدید احساس سے دوچار تھا۔ وہ اپنی ماں کے ہاتھ میں محض کٹھن تلی تھا۔ ماں کے نزدیک کروگر برینٹ کمپنی کے علاوہ کسی اور چیز کی اہمیت نہیں تھی۔ ماں کی نظروں میں وہ محض ایک وارث تھا۔

کروگر برینٹ کمپنی کا وارث!

ٹونی جب گھر آیا تو وہ بہت شراب پیے ہوئے تھا۔ کیٹ اس

وقت لاہری میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اور میں بہادری کی موت مرنا چاہتا ہوں۔“  
اس سے اگلے دن اخبارات میں کیٹ نے پڑھا کہ سیاہ فام  
رہ نمایا ہڈا کوئیل سے فرار ہونے کی کوشش میں گولی مار کر ہلاک  
کر دیا گیا۔

کیٹ نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کبھی جنوبی افریقہ کی سرزمین  
پر قدم نہیں رکھے گی۔۔۔۔۔ بھی نہیں۔۔۔۔۔

نیو یارک واپس آنے کے کچھ دنوں کے بعد کیٹ نے  
منصوبہ بنایا کہ ٹوٹی ایک بہت مال دار شخص کی بیٹی لوسی سے  
شادی کر لے۔ کیٹ چاہتی تھی کہ شادی کے بعد اس شخص کے  
سارے کاروبار کو کروڑ بریٹ پنی میں ضم کرے اور اس طرح  
کپنی کا منافع اور زیادہ بڑھ جائے۔

ٹوٹی نے کیٹ کے سارے منصوبے کو ٹھکرا کر ماریان سے  
شادی کر لی۔ وہ بہت ایک کم مال دار گھرانے کی لڑکی تھی، لیکن  
ٹوٹی اسے چاہنے لگا تھا اور وہ خود بھی ٹوٹی کو بہت پسند کرتی تھی۔  
شادی کے بعد جتنی مومن پر جانے سے پہلے ٹوٹی نے اپنی ماں کو  
فون پر اس شادی کی اطلاع دی۔ کیٹ ماریان سے واقف  
تھی۔

”ماریان ٹوٹی کو اب ایک بنیادے گی۔“ کیٹ نے سوچا۔  
ٹوٹی کا بیٹا۔ کروگر برینٹ کپن کا لگا وارث۔۔۔۔۔

جتنی مومن سے واپس آنے کے بعد ماریان اور ٹوٹی کیٹ سے  
ملنے گئے کیٹ ماریان کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آئی۔  
اور رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔ وہ  
دونوں ہر دوسرے تیسرے دن ایک دوسرے کو فون کرتی رہتی  
تھیں۔

ماریان اور کیٹ دونوں تنہا تھیں۔ جب ماریان نے کیٹ کو  
یہ بات بتائی۔

”میں ڈاکٹر ہارلے کے پاس گئی تھی۔ جو بلیک میل خانہ ان  
کا فیس ڈاکٹر ہے۔ میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ ڈاکٹر ہارلے  
نے میرا معائنہ کرنے کے بعد مجھے مشورہ دیا کہ میں ماں بننے  
سے سب سے خیل میں میرے لیے ماں بننا  
خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہمیں بچوں کا  
شوق ہو تو ہم کوئی بچہ لے کر پال لیں۔“

کیٹ بڑی مشکل سے اپنی مایوسی اور ناامیدی کو چھپانے کی  
کوشش کر رہی تھی۔ ماریان کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن پر  
بھروسے کی طرح برس رہا تھا۔

”ڈاکٹر ہارلے ایک طویل عرصے سے ہمارے خاندان کا  
ڈاکٹر ہے۔ مکروہ بہت ہی اور شکی آدمی ہے۔ ماریان جب بھی

”میری ڈو میٹیک سے بات ہوئی تھی۔“ اس نے کیٹ سے  
کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میرے پیٹھ پیچھے تم دونوں کو میرے اوپر  
بننے میں بڑا لطف آیا ہوگا؟“

کیٹ اس کی یہ بات سننے ہی پریشان ہو گئی۔ ”ٹوٹی۔۔۔۔۔“  
”آج سے تم میری ذاتی زندگی میں کوئی دخل نہیں دو گی۔“  
اس نے چلا کر کہا۔ ”اچھی طرح سن لو مجھے میرے حال پر چھوڑ  
دو۔“ اور وہ پیر پختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اس سے اگلے دن ٹوٹی نے ایک الگ اپارٹمنٹ کرائے پر  
لے لیا اور اپنی ماں کا گھر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے اس نے  
اپنی ماں سے جس کاروباری نوعیت کے تعلقات رکھے۔ وہ کپنی  
آتا تھا اور حسب سابق کام بھی کرتا تھا لیکن اپنی ماں کی جانب  
سے اس کا رویہ صرف دفتری امور تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔  
کیٹ نے کئی بار مصالحت کی کوشش کی لیکن ٹوٹی نے اسے نظر  
انداز کر دیا۔

کیٹ کا دل بہت دکھتا تھا لیکن اس نے اپنے خیال کے  
مطابق وہی کچھ کیا تھا جو ٹوٹی کے لیے ٹھیک تھا۔ بالکل اس طرح  
جس طرح اس نے ڈیوڈ کے ساتھ ایک بار وہی کیا تھا جو ڈیوڈ  
کے لیے ٹھیک تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ ڈیوڈ کپنی کو چھوڑ کر  
چلا جائے اور جو ریٹینے شادی کر لے۔ اور اسی طرح وہ یہ  
نہیں چاہتی تھی کہ ٹوٹی مہینی سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ کیٹ ٹوٹی  
کو اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

ایک دن براڈ راجرس نے کیٹ کو اطلاع دی کہ جنوبی افریقہ  
میں پولیس نے ہانڈا کو گرفتار کر لیا ہے۔ کیٹ اسی دن جو ہاس  
برک کے لیے روانہ ہوئی۔

کیٹ نے وہاں پہنچنے ہی جیل خانہ جات کے ڈائریکٹر کو فون  
کیا۔ ڈائریکٹر نے اسے بتایا کہ ہانڈا جیل میں قید نہ تھا  
ہے اور اس سے ملنے کی کئی اجازت نہیں ہے۔ تاہم کیٹ  
بلیک ویل اس سے مل سکتی ہے۔

”اوہ ہانڈا۔“ کیٹ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم  
میں اس سے باہر کس طرح نکلو گے؟“ ہانڈا بہت یوڑھا ہو چکا  
تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔

”صرف تاوتل میں!“ ہانڈا نے ہنسنے ہوئے جواب دیا۔  
میرے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے۔“

”میں ہمیں اعلیٰ ترین وکٹافراہم کروں گی۔۔۔۔۔“  
”سات بات کو بھول جاؤ کیٹ۔“ ہانڈا نے اس کی بات  
سنے ہوئے کہا۔ ”میں نے بہادری کے ساتھ جدوجہد کی ہے



ماہر امراض نسوان ڈاکٹر میٹسن نے ماریاں کا بلڈ پریشر لیا۔ اس نے بلڈ پریشر کے آلے کو بے یقینی کے ساتھ دیکھا اور وہ بارہ بلڈ پریشر لیا۔ پھر اس نے نرس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اسے آپریشن روم میں لے چلو۔ جلدی کرو۔ بہت جلدی۔“ ٹوٹی اسپتال کے کوریڈور میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ جب اس نے ڈومینیک اور اس کے دوست بین کو ایک طرف سے آتے دیکھا۔ ڈومینیک اسے دیکھ کر رک گئی۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو ٹوٹی؟“ ڈومینیک نے پوچھا۔  
 ”میری بیوی کی زچگی ہونے والی ہے۔“ ٹوٹی نے کہا۔  
 ”کیا اس کا بندوبست بھی تمہاری ماں نے کیا ہے؟“ ڈومینیک کے دوست بین نے استہزائی انداز میں پوچھا۔  
 ”اس بات کا کیا مطلب؟“ ٹوٹی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ڈومینیک نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے لیے ہر چیز کا بندوبست تمہاری ماں کرتی ہے۔“ بین نے کہا۔  
 ”بین! پلیز چپ رہو۔“ ڈومینیک نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں؟“ بین نے کہا۔ ”یہ سچ ہے۔ یہ سب کچھ تم ہی نے تو مجھے بتایا تھا۔“  
 ”یہ کیا باتیں کر رہے ہو۔“ ٹوٹی نے ڈومینیک سے مخاطب ہو کر پوچھا۔  
 ”چھ تھیں۔“ ڈومینیک نے کہا۔ ”چلو بین، ہم یہاں سے چلیں۔“

لیکن بین اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ”کاش میری بھی تمہاری جیسی ماں ہوتی۔ ماڈل کی ضرورت ہو تو وہ فراہم کر دیتی۔ نمائش کی ضرورت ہو تو وہ اس کا بندوبست کر دیتی۔“

”بین! خدا سے والے پناہ۔“ ڈومینیک نے اسے وہاں سے لے جانے کی کوشش کی۔

”نٹھرو۔“ ٹوٹی نے کہا۔ ”اس نے کہا ہے کہ میری نمائش کا اہتمام میری ماں نے کیا تھا۔ اسے بتاؤ ڈومینیک کہ یہ خدا ہے۔“ ڈومینیک کا چہرہ مرجھا سا گیا۔

”کہو ڈومینیک کہ یہ غلط ہے۔“ ٹوٹی نے کہا۔  
 ”نہیں ٹوٹی۔“ ڈومینیک نے نیم مردہ آواز میں کہا۔ ”یہ سچ ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اس نمائش کا اہتمام میری ماں نے نہ تھا؟“ ٹوٹی نے لڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اس نے جارج کو

کوئی عورت ماں بننے والی ہوتی ہے تو وہ اپنی زندگی کا خطرہ مول لیتی ہے۔ ساری زندگی ہی خطروں سے بھرپور ہے اصل بات یہ ہے کہ انسان یہ فیصلہ کرے کہ کون سا خطرہ مول لیا جائے اور کس خطرے سے بچا جائے بہتر ہے کہ تم ٹوٹی سے اس بات کو پوشیدہ رکھو۔“

”مجھے تم سے اتفاق ہے۔“ ماریاں نے کہا۔ ”ہم ٹوٹی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔“

اس کے تین ماہ بعد ماریاں کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ ٹوٹی نے جب یہ خبر سنی تو وہ خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ کیٹ فحش مندی کے احساس سے سرشار ہو گئی۔ ڈاکٹر ہارلے خوفزدہ ہو گیا۔

”میں فوراً اسقاط کا بندوبست کرتا ہوں۔“ ڈاکٹر ہارلے نے ماریاں سے کہا۔

”نہیں ڈاکٹر ہارلے۔“ ماریاں نے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میں ایک بچے کی ماں ہوں گی۔“

جب ماریاں نے کیٹ کو ڈاکٹر ہارلے کی تجویز کے بارے میں بتایا تو کیٹ آگ بگولا ہو کر ڈاکٹر ہارلے کے دفتر میں داخل ہو گئی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم میری بہو کو اسقاط کا مشورہ دو؟“ اس نے سخت غصے کے عالم میں کہا۔

”کیٹ! ڈاکٹر ہارلے نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”میں نے اسے بتادیا ہے کہ اگر وہ حمل کی زندگی اپوری کرے گی تو اس میں اس کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔“

”تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہے گی۔ مہربانی کر کے اسے خوف زدہ مت کرو۔“

آٹھ ماہ کے بعد ایک رات کے آخری حصے میں ماریاں زور زور سے سراتے لگی۔ ٹوٹی نے بیدار ہو گیا اس نے فوراً اسپتال فون کیا۔

”جبراً موت ڈیئر۔“ ٹوٹی جلدی جلدی سانس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ابھی اسپتال لیے چلتا ہوں۔“

”آہ۔“ اف جلدی کر ٹوٹی۔ ماریاں نے یہ مشکل کہا۔

ماریاں اس وقت سوچ رہی تھی کہ کیا وہ ٹوٹی کو وہ بات بتا دے جو ڈاکٹر ہارلے نے کہی تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ اب اس سے ٹوٹی فائدہ نہیں ہے۔ اسے امید تھی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔

جب ٹوٹی ماریاں کے لیے اسپتال پہنچی تو وہاں سارے انتظامات مکمل تھے۔ ٹوٹی کو انتظار گاہ میں بٹھادیا گیا۔ اور ماریاں کو معائنہ کے لیے لے جایا گیا۔

اس کے لیے رقم دی تھی؟“

”نوٹی جارج کو تمہاری تصویریں اچھی لگی تھیں۔“ ڈومینیک نے آہستہ سے کہا۔

”اسے نقاد فن آندرے یوساؤ کے بارے میں بھی بتا دو ڈومینیک۔“ مین نے کہا۔

”نہیں بین چلو۔“ ڈومینیک نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ لیکن ٹوٹی نے ان کا راستہ روک لیا۔

”کیا آندرے یوساؤ کو میری نمائش میں میری ماں نے بھیجا تھا۔“ ٹوٹی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ڈومینیک کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ ”لیکن اس نے میری تصاویر کے لیے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔“ ٹوٹی نے کہا۔ اس کی آواز درد سے بھر پور تھی۔

”نہیں ٹوٹی۔“ ڈومینیک نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس نے تمہاری تصویریں کو پسند کیا تھا۔ آندرے یوساؤ نے تمہاری ماں کو بتایا تھا کہ تم ایک بہت بڑے فن کار بن سکتے ہو۔ تمہارے اندر اس کی صلاحیت موجود ہے۔“

ٹوٹی کا دل اندر سے کٹنے لگا۔ اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”تو۔ تو۔ میری ماں نے مجھے تباہ کرنے کے لیے یوساؤ کو رقم دی؟“ ٹوٹی یہ مشکل کہہ رہا۔

اس کا خیال تھا کہ تمہاری بہتری اس میں ہے۔ ڈومینیک نے کہا اور اپنے دوست کے ساتھ چل گئی۔

ٹوٹی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماں اس قدر خوفناک عورت ہو سکتی ہے۔ اس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی۔ ”وہ مجھ سے مسلسل جھوٹ بولتی رہی ہے اور مجھے دھوکا دیتی رہی ہے۔“

ٹوٹی نے سوچا۔ ”وہ مجھے کبھی بھی میری مرضی کی زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کے لیے سب کچھ اس کی بچی ہے۔“ سرور برینٹ بچی۔ انسان اس کی نظر میں کمزوری کے ٹکڑے ہیں۔ بے حس و جاہد ٹکڑے۔ شطرنج کے مہرے۔

جنہیں وہ اپنی مرضی سے جس طرح چاہے اوتی بدلتی رہے۔“ ٹوٹی خاموشی سے گور دیور سے آ کر انتظار گاہ میں بیٹھ گیا۔

اسے ساری دنیا تار یک نظر آ رہی تھی۔

اندرا پریشن روم میں ڈاکٹر ماریان کی جان بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک گر گیا تھا۔ اور دل کی دھڑکن بھی بے ترتیب تھی۔ اسے اس کی سبب دی گئی اور خون بھی چڑھایا گیا لیکن سب بے سود ہوا۔ جب پہلا پیچہ پیدا ہوا تو ماریان بے ہوش تھی اور جب اس کے تین منٹ بعد

دوسرا جڑواں بچہ پیدا ہوا تو ماریان مر چکی تھی۔

کسی نے نوٹی کو آواز دی۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ڈاکٹر میٹسن اس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

”مسٹر بلک ویل، تم دو خوب صورت اور صحت مند جڑواں بچیوں کے باپ ہو۔“ اس نے کہا۔ ٹوٹی نے اس کی آنکھوں میں کچھ اور بھی دیکھ لیا۔

”اور ماریان؟“ ٹوٹی نے پوچھا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے نا؟“

”مجھے افسوس ہے۔“ ڈاکٹر میٹسن نے کہا۔ ”ہم نے اپنی پوری کوشش کی مگر ہم اسے نہ بچا سکے۔“

اور اسی وقت ڈاکٹر ہارلے سامنے آتا ہوا نظر آیا۔ ڈاکٹر میٹسن واپس چلا گیا۔

”انہوں نے اسے مار دیا۔“ ٹوٹی نے روتے ہوئے کہا۔ ”وہ مر گئی۔ وہ مر گئی۔“

”مجھے بہت افسوس ہے ٹوٹی۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔ ”لیکن اسے کسی نے نہیں مارا۔ میں نے اسے کئی ماہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگر اس نے حمل کی مدت پوری کرنے پر اصرار کیا تو اس صورت میں اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔“

ٹوٹی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر ہارلے کیا کہہ رہا ہے۔ تم کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟“ اس نے کہا۔

”کیا ماریان نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔ تمہاری ماں نے بھی تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“

ٹوٹی حیرانی کے ساتھ ڈاکٹر ہارلے کی شکل دیکھ رہا تھا۔ ”میری ماں نے؟“

”ہاں ٹوٹی!“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔ ”میں نے ماریان کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لیکن تمہاری ماں میرے پاس آ کر سخت ناراض ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ماریان کو خوف زدہ کر رہا ہوں۔ میں نے ماریان کو اسقاط کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن تمہاری ماں نے اس سے کہا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے بہت افسوس ہے ٹوٹی۔ ٹوٹی، میں نے تمہاری جڑواں بیٹیوں کو دیکھا ہے۔ وہ دونوں بہت خوب صورت ہیں۔ کیا تم انہیں دیکھنا پسند کرو گے؟“

لیکن ٹوٹی کچھ نہیں سن رہا تھا۔

ٹوٹی اسپتال سے نکلا اور سیدھا کیٹ کے گھر پہنچا۔ کیٹ کے بلڈرے جس کا نام لکھنا تھا توئی کے لیے دروازہ کھولا۔

”گڈ مارننگ مسٹر بلک ویل۔“ کیٹ نے کہا۔

”گڈ مارننگ!“ ٹوٹی نے جواب دیا۔

لیسٹر نے ٹوٹی کی اجڑی اجڑی شکل کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ٹھاک تو ہے مسٹر بلیک ویل؟“

”سب ٹھیک ہے۔“ ٹوٹی نے جواب دیا۔ ”کیا تم مجھے ایک پیالی کافی بنا دو گے؟“

”یقیناً۔“ لیسٹر نے جواب دیا۔

ٹوٹی نے لیسٹر کو باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

”قدم بڑھاؤ ٹوٹی۔“ کسی اندرونی آواز نے ٹوٹی کو حکم دیا۔

”ہاں ابھی اسی وقت!“ ٹوٹی کے اندر سے ایک آواز ابھری اور ٹوٹی نرانی روم میں داخل ہو گیا۔ وہ اس الماری کے پاس پہنچا جس میں تھیں روں کا ذخیرہ رہتا تھا۔

”الماری کھولو ٹوٹی!“ اس کے اندر کی آواز نے اسے حکم دیا۔

اس نے الماری کھولی اور تھیں روں کے ذخیرے میں سے ایک ریوالماری کا انتخاب کیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ ریوالماری بھرا ہوا ہے۔

”وہ اوپر ہوگی ٹوٹی، اپنے کمرے میں۔“ اندرونی آواز نے اس سے کہا۔

ٹوٹی میزھیں پڑھنے لگا۔ اسے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں اپنی خرابی کی خود سے دادر نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دولت کے لانچ اور بوس نے اسے اندھا کر دیا ہے اب وہ اس کا علاج کر دے گا۔ کروگر برینٹ کمپنی نے اس کی ماں کو اس کی روح تک سے محروم کر دیا تھا۔ اور وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ وہ کیوں کر رہی ہے اس کی ماں اور کمپنی ایک ہو کر رہ گئے تھے اور جب اس کی ماں مر جائے گی تو کمپنی بھی مر جائے گی۔

وہ کیٹ کے بیڈروم کے دروازے پر پڑھا۔

”دروازہ کھولو۔“ اندرونی آواز نے اسے حکم دیا۔

ٹوٹی نے جب دروازہ کھولا تو کیٹ لباس تبدیل کر کے باہر آنے کی تیاری کر رہی تھی۔

”ٹوٹی!“ اس نے حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ کہا۔ ”یہ... کیا...؟“

وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکی۔ ٹوٹی نے ٹریگرو دیا۔

کیٹ کے بیلر کے وحشت ناک فون کے بعد ڈاکٹر ہارلے جب آندھی طوفان کی رفتار سے وہاں پہنچا تو اس نے کیٹ کے بیڈروم میں ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ کیٹ خون میں لٹ پٹ فٹ پر بیڑی ہوئی تھی۔ اس کی گردن اور سینے میں

گولیوں کے زخم تھے۔ خون بہہ بہہ کر بیڈروم کے فرش کے سفید قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ ٹوٹی وحشتانہ انداز میں اس کی الماریوں میں سے کپڑے نکال کر انہیں پیچی سے کاٹ رہا تھا۔ اور فرش پر پھیلتا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ہارلے نے فوراً ایسولینس کے لیے فون کیا۔ پھر اس نے جھک کر کیٹ کی نبض دیکھی۔ نبض بہت ہلکی تھی اور کیٹ کا چہرہ ٹیلا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کیٹ کے ایک آنکھیں لگایا۔

”بات کیا ہوئی؟“ ڈاکٹر ہارلے نے بیلر سے پوچھا۔

لیسٹر اس قدر پریشان تھا کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ”مسٹر بلیک ویل نے مجھ سے کافی پیانے کے لیے کہا۔ میں باورچی خانے میں تھا جب میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ میں بھاگتا ہوا اوپر آیا اور میں نے مسز ڈیوڈ بلیک ویل کو فرش پر اسی طرح پڑے ہوئے پایا۔ مسٹر بلیک ویل اپنی ماں کے پاس کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے۔ اب میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دوں گا مگر۔ سب کچھ ختم ہو گیا اور پھر وہ الماری سے کپڑے نکال نکال کر انہیں پیچی سے کاٹنے لگے۔“

”تم کیا کر رہے ہو ٹوٹی؟“ ڈاکٹر ہارلے نے ٹوٹی کی طرف مڑ کر پوچھا۔

”میں بھی کی مدد کر رہا ہوں۔“ ٹوٹی نے جنونی انداز میں ایک کپڑے کو چیرتے ہوئے کہا۔ ”میں کمپنی کو تباہ کر رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے مجھے باریاں سے محبت تھی، بہت محبت تھی، مجھے اس سے بہت محبت تھی۔“ اور وہ کپڑے کا ٹکڑا رہا۔

کیٹ کو ایک ایسے پرائیویٹ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا جو کروگر برینٹ لمیٹڈ کمپنی کی ملکیت تھا۔ گولیوں نکالنے کے لیے آپریشن کیا گیا اور خون دیا گیا۔

تین مردوں کی مدد سے ٹوٹی کو ایک دوسری ایسولینس میں بٹھا دیا گیا۔ اور وہ بھی اس وقت جب ڈاکٹر ہارلے نے اسے غنودھی لانے والا ایک آنکھشن دیا۔ ٹوٹی پر جنون کی کیفیت طاری تھی اور وہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

ایسولینس والوں نے پولیس کو مطلع کر دیا تھا اور ایک پولیس پارٹی موقع واردات پر پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر ہارلے نے براڈ راجس کو بلایا اور پولیس کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں فائرنگ کے اس واقعے کی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر جب انتہائی دیکھ بھال کے یونٹ میں کیٹ کو دیکھنے گیا۔ تو اس وقت کیٹ ہوش میں آ چکی تھی۔ آپریشن کامیاب ہو گیا تھا اور کیٹ کی جان بچائی گئی تھی۔

”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ کیٹ نے کمزور آواز میں ڈاکٹر ہارلے سے پوچھا۔

”وہ خیریت سے ہے۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔ ”تم اس کے بارے میں پریشان مت ہو۔“

ٹوٹی کو اس وقت تک دماغی اور نفسیاتی امراض کے ایک پرائیویٹ سینی ٹوریم میں پہنچایا گیا تھا۔

”ڈاکٹر ہارلے! اس نے مجھے کیوں مارنا چاہا؟“ کیٹ کی آواز ناقابل برداشت درد سے بھر پور تھی۔

”وہ تمہیں ماریاں کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔

”یہ پاگل پن ہے۔“ کیٹ نے آہستہ سے کہا۔

”اس کے بارے میں زیادہ مت سوچو کیٹ۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر ہارلے کے جانے کے بعد کیٹ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ سچ تھا۔ اسے یہ سب کچھ کسی بھائیک خواب کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ ”میں تو ماریا کو ہلاک کر رہی تھی۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”میں اسے کس طرح ہلاک کر سکتی تھی۔ اور میں اسے اس لیے پسند کرتی تھی کیونکہ ٹوٹی اسے پسند کرتا تھا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے بیٹے کے لیے کیا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ ٹوٹی بغیر اولاد کے رہے؟“

”نہیں! تو اسے اولاد کے قتل سے محروم نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ نہیں! وہ غلطی پر ہے۔ میں نے جو کچھ سوچا ٹھیک سوچا۔“

”کیٹ اپنے ڈاکٹر ہارلے سیدار ہل ہسپتال میں آرام کر رہی تھی جہاں اس کی صحت تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ ٹوٹی دماغی و نفسیاتی امراض کے ایک پرائیویٹ سینی ٹوریم میں تھا جہاں اس کی بہترین نگہداشت کی جارہی تھی۔ کیٹ نے پیرس ویانا، برلن اور لندن سے دماغی اور نفسیاتی امراض کے ماہرین کی ٹیمیں کی میس بلوائی تھیں۔ لیکن وہ سب مل کر بھی ٹوٹی کو اچھا نہ کر سکے۔ اس کا شہر خطرناک ناگلوں میں کیا گیا تھا۔ اور اسے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔

”ہم اسے صرف دو اؤس کے سہارے پر سگون رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر مورس نے کہا۔ جو اسی سینی ٹوریم کا ایک نوجوان ڈاکٹر تھا۔ ”لیکن جیسے ہی وہ اؤس کا اثر ختم ہوتا ہے وہ پھر تشدد پراثر آتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کا پرتشدد رویہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کی دماغی حالت بھی نارمل نہیں ہو سکے گی۔“

”نہیں! یہ اس کا اپنا ٹوٹی نہیں تھا۔“ کیٹ نے سوچا۔ ”یہ وہ نرم مزاج اور منکسر طبیعت والا ٹوٹی نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ کوئی تشدد داغی، جس کے بارے میں یہ باتیں کی جارہی تھیں۔“

دونوں جزواں بچیوں کو کیٹ کے مکان میں پہنچایا گیا تھا اور ان کے لیے مکان کے ایک حصے میں زمری قائم کر دی گئی تھی۔ کیٹ نے کئی گورنوں کا انٹرویو لیا اور بالآخر ایک فرانسیسی عورت سولانگ ڈوناس کو گورنس کے طور پر منتخب کر لیا۔

کیٹ نے پہلے پیدا ہونے والی بچی کا نام ایو اور چند منٹ بعد پیدا ہونے والی لڑکی کا الیزانڈرا رکھا۔ ان دونوں کی شکلیں ہو بہو ایک جیسی تھیں۔ انہیں الگ الگ بچانا تقریباً ناممکن تھا کیٹ ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ وہ دونوں بے حد خوب صورت بچیاں تھیں اور دونوں ہی تیز اور ذہین معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن جلد ہی کیٹ نے محسوس کر لیا کہ ایو الیزانڈرا کے مقابلے میں زیادہ تیز فہم اور ذہین ہے۔ ایو نے پہلے بگنا چلنا اور بولنا سیکھا اور اس کے بعد الیزانڈرا نے۔ الیزانڈرا ہر معاملے میں ایو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی تھی۔

ایو نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے اس نے الیزانڈرا سے نفرت کی۔

دونوں بہنوں کے لیے ایک جیسی چیزیں لائی جاتی تھیں، ایک جیسے کھلونے ایک جیسے کپڑے اور یہ بات ایو کو سخت نا پسند تھی۔ وہ اپنی ہر چیز میں الیزانڈرا کو شریک پاتی تھی اور اس سے نفرت کرتی تھی۔ جب کوئی الیزانڈرا کو گود میں اٹھاتا تھا یا اسے پیار کرتا تھا یا اسے کوئی تحفہ دیتا تھا تو ایو دل میں سلگنے لگتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ صرف اسے لیے پاتی تھی۔ اسے اس بات سے نفرت تھی کہ الیزانڈرا کی شکل اس کی جیسی کیوں ہے۔ دادی اماں کی محبت میں الیزانڈرا اس کے ساتھ شریک کیوں ہے۔

لیکن الیزانڈرا ایو کو پسند کرتی تھی۔ وہ اپنی ہر چیز میں سے ایو کو بہ خوشی حصہ دینے کے لیے تیار رہتی تھی۔ لیکن ایو اسے مطمئن نہ بھیجی۔ وہ الیزانڈرا سے اس کی تمام کی تمام چیزیں لے لیتا چاہتی تھی۔

اپنی پانچویں سالگرہ سے ایو نے الیزانڈرا کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔

سالگرہ سے ایک رات پہلے جب ایو کو یقین ہو گیا کہ اب سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

سارے لوگ سوچے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر کے پاس گئی

گولیوں کے دھم تھے۔ خون بہہ کر بیڈروم کے فرش کے سفید قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ ٹوٹی وحشیانہ انداز میں اس کی الماریوں میں سے کپڑے نکال کر انہیں پھینچنے سے کاٹ رہا تھا۔ اور فرش پر پھینکا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ہارلے نے فوراً ایوبو لنس کے لیے فون کیا۔ پھر اس نے جبکہ کریٹ کی نبض دیکھی۔ نبض بہت ہلکی تھی اور کیٹ کا چہرہ نیلا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کیٹ کے ایک انجکشن لگایا۔

”بات کیا ہوئی؟“ ڈاکٹر ہارلے نے ہلتر سے پوچھا۔  
لیسٹر اس قدر پریشان تھا کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ”مسٹر بلیک ویل نے مجھ سے کافی بنانے کے لیے کہا۔ میں باورچی خانے میں تھا جب میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ میں بھاگتا ہوا آیا اور میں نے مسز ڈیوڈ بلیک ویل کو فرش پر اسی طرح پڑے ہوئے پایا۔ مسٹر بلیک ویل اپنی ماں کے پاس کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے۔ اب میں تمہیں کوئی تکلف نہیں دوں گا مگر۔ سب کچھ ختم ہو گیا اور پھر وہ الماری سے کپڑے نکال نکال کر انھیں پھینچنے سے کاٹنے لگے۔“  
”تم کیا کر رہے ہو ٹوٹی؟“ ڈاکٹر ہارلے نے ٹوٹی کی طرف مڑ کر پوچھا۔

”میں مچی کی مدد کر رہا ہوں۔“ ٹوٹی نے جنونی انداز میں ایک کپڑے کو چیرتے ہوئے کہا۔ ”میں مبینی کو تیار کر رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے مجھے باریاں سے محبت تھی بہت محبت تھی، مجھے اس سے بہت محبت تھی۔“ اور وہ کپڑے کا ٹکڑا ہا۔  
کیٹ کو ایک ایسے پرائیویٹ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچایا گیا جو گروگر بریٹ لمیٹڈ کمپنی کی ملکیت تھا۔ گولیاں نکالنے کے لیے آپریشن کیا گیا اور خون دیا گیا۔

تین مردنوں کی مدد سے ٹوٹی کو ایک دوسری ایوبو لنس میں بٹھایا گیا۔ اور وہ بھی اس وقت جب ڈاکٹر ہارلے نے اسے غنودنی لانے والا ایک انجکشن دیا۔ ٹوٹی پر جنون کی کیفیت طاری تھی اور وہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔  
ایوبو لنس والوں نے پولیس کو مطلع کر دیا تھا اور ایک پولیس پارٹی موقع واردات پر پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر ہارلے نے براڈ راجس کو بلایا اور پولیس کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں فائرنگ کے اس واقعے کی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر جب انتہائی دیکھ بھال کے ہونٹ میں کیٹ کو دیکھنے گیا۔ تو اس وقت کیٹ ہوش میں آ چکی تھی۔ آپریشن کامیاب ہو گیا تھا اور کیٹ کی جان بچائی گئی تھی۔

لیسٹر نے ٹوٹی کی اجڑی اجڑی شکل کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ٹھاک تو ہے مسٹر بلیک ویل؟“  
”سب ٹھیک ہے۔“ ٹوٹی نے جواب دیا۔ ”کیا تم مجھے ایک پیالی کافی بنا دو گے؟“

”یقیناً۔“ لیسٹر نے جواب دیا۔  
ٹوٹی نے لیسٹر کو باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

”قدم بڑھاؤ ٹوٹی۔“ کسی اندرونی آواز نے ٹوٹی کو حکم دیا۔  
”ہاں ابھی اسی وقت!“ ٹوٹی کے اندر سے ایک آواز ابھری اور ٹوٹی ٹرائی روم میں داخل ہو گیا۔ وہ اس الماری کے پاس پہنچا جس میں ہتھیاروں کا ذخیرہ رہتا تھا۔  
”الماری کھولو ٹوٹی!“ اس کے اندر کی آواز نے اسے حکم دیا۔  
اس نے الماری کھولی اور ہتھیاروں کے ذخیرے میں سے ایک ریوایور کا انتخاب کیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ ریوایور بھرا ہوا ہے۔

”وہ اوپر ہوگی ٹوٹی! اپنے کمرے میں۔“ اندرونی آواز نے اس سے کہا۔

ٹوٹی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں اپنی خرابی کی خود ذمہ دار نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دولت کے لالچ اور ہوس نے اسے اندھا کر دیا ہے اور اب وہ اس کا علاج کر دے گا۔ گروگر بریٹ کمپنی نے اس کی ماں کو اس کی روح تک سے محروم کر دیا تھا۔ اور وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ وہ کیوں کر رہی ہے اس کی ماں اور کمپنی ایک ہو کر رہ گئے تھے اور جب اس کی ماں مر جائے گی تو کمپنی بھی مر جائے گی۔

وہ کیٹ کے بیڈروم کے دروازے پر تھا۔  
”دروازہ کھولو۔“ اندرونی آواز نے اسے حکم دیا۔

ٹوٹی نے جب دروازہ کھولا تو کیٹ لباس تبدیل کر کے باہر آنے کی تیاری کر رہی تھی۔

”ٹوٹی!“ اس نے حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ کہا۔ ”یہ... کیا؟“

وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکی۔ ٹوٹی نے فریگڈر بادیا۔

کیٹ کے ہلتر کے وحشت ناک فون کے بعد ڈاکٹر ہارلے جب آندھی طوفان کی رفتار سے وہاں پہنچا تو اس نے کیٹ کے بیڈروم میں ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ کیٹ خون میں لت پت فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی گردن اور سینے میں

”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ کیٹ نے کمزور آواز میں ڈاکٹر ہارلے سے پوچھا۔

”وہ خیریت سے ہے۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔ ”تم اس کے بارے میں پریشان مت ہو۔“

ٹوٹی کو اس وقت تک دماغی اور نفسیاتی امراض کے ایک پرائیویٹ سینی ٹوریم میں پہنچا دیا گیا تھا۔

”ڈاکٹر ہارلے اس نے مجھے کیوں مارنا چاہا؟“ کیٹ کی آواز ناقابل برداشت درد سے بھر پور تھی۔

”وہ تمہیں ماریاں کی موت کا ذمے دار ٹھہراتا ہے۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔

”یہ پاگل پن ہے۔“ کیٹ نے آہستہ سے کہا۔

”اس کے بارے میں زیادہ مت سوچو کیٹ۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کہا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر ہارلے کے جانے کے بعد کیٹ بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ سچ تھا۔ اسے یہ سب کچھ کسی بھائیک خواب کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ ”میں تو ماریاں کو پسند کرتی تھی۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”میں اسے کس طرح ہلاک کر سکتی تھی۔ اور میں اسے اس لیے پسند کرتی تھی کیونکہ ٹوٹی اسے پسند کرتا تھا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے بیٹے کے لیے کیا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ ٹوٹی بغیر اولاد کے رہے؟ میں تو اسے اولاد کے تحفے سے محروم نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ نہیں، وہ غلطی پر ہے۔ میں نے جو کچھ سوچا ٹھیک سوچا۔“

”کیٹ اپنے ڈاکٹر ہارلے سیدار مل ہاؤس میں آرام کر رہی تھی جہاں اس کی سخت تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ ٹوٹی دماغی و نفسیاتی امراض کے ایک پرائیویٹ سینی ٹوریم میں تھا جہاں اس کی بہترین نگہداشت کی جا رہی تھی۔ کیٹ نے پیرس، وینا، برلن اور لندن سے دماغی اور نفسیاتی امراض کے ماہرین کی ٹیمیں کی ٹیمیں بلائی تھیں۔ لیکن وہ سب مل کر بھی ٹوٹی کو اچھا نہ کر سکے۔ اس کا شمار خطرناک پاگلوں میں کیا گیا تھا۔ اور اسے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔

”ہم اسے صرف دواؤں کے سہارے پر سکون رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر مورس نے کہا۔ جو اسی سینی ٹوریم کا ایک نوجوان ڈاکٹر تھا۔ ”لیکن جیسے ہی دواؤں کا اثر ختم ہوتا ہے وہ پھر تشدد پر اتر آتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کا پر تشدد رویہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کی دماغی حالت بھی نارمل نہیں ہو سکتی۔“

”تمہیں یہ اس کا اپنا ٹوٹی نہیں تھا۔“ کیٹ نے سوچا۔ ”یہ وہ نرم مزاج اور منکسر طبیعت والا ٹوٹی نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ کوئی تشدد اجنبی، جس کے بارے میں یہ باتیں کی جا رہی تھیں۔“

دونوں بڑواں بچیوں کو کیٹ کے مکان میں پہنچا دیا گیا تھا اور ان کے لیے مکان کے ایک حصے میں زمری قائم کر دی گئی تھی۔ کیٹ نے کئی گورنسون کا انٹرویو لیا اور بالاخر ایک فرانسیسی عورت سولانگ ڈوناس کو گورنر کے طور پر منتخب کر لیا۔

کیٹ نے پہلے پیدا ہونے والی بچی کا نام ایوا اور چند منٹ بعد پیدا ہونے والی لڑکی کا الیزانڈرا رکھا۔ ان دونوں کی شکلیں ہو بہو ایک جیسی تھیں۔ انہیں الگ الگ پہنچانا تقریباً ناممکن تھا کیٹ ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دونوں بے حد خوب صورت بچیاں تھیں اور دونوں ہی تیز اور ذہین معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن جلد ہی کیٹ نے محسوس کر لیا کہ ایوا الیزانڈرا کے مقابلے میں زیادہ تیز فہم اور ذہین ہے۔ ایوانے پہلے ریگننا چنا اور بولنا سیکھا اور اس کے بعد الیزانڈرا نے۔ الیزانڈرا ہر معاملے میں ایوانے کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی تھی۔

ایوانے جب سے ہوش سنبھالا تب سے اس نے الیزانڈرا سے نفرت کی۔

دونوں بہنوں کے لیے ایک جیسی چیزیں لائی جاتی تھیں، ایک جیسے کھلونے ایک جیسے کپڑے اور یہ بات ایوانے سے نا پسند تھی۔ وہ اپنی ہر چیز میں الیزانڈرا کو شکوک پاتی تھی اور اس سے نفرت کرتی تھی۔ جب کوئی الیزانڈرا کو گود میں اٹھا لیتا تھا یا اسے پیار کرتا تھا یا اسے کوئی تحفہ دیتا تھا تو ایوانے ہی دل میں شلٹنے مکتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ صرف اپنے لیے چاہتی تھی۔ اسے اس بات سے نفرت تھی کہ الیزانڈرا کی شکل اس کی جیسی کیوں ہے۔ دادی اماں کی محبت میں الیزانڈرا اس کے ساتھ شریک کیوں ہے۔

لیکن الیزانڈرا ایوانے کو پسند کرتی تھی۔ وہ اپنی ہر چیز میں سے ایوانے کو بہ خوشی حصہ دینے کے لیے تیار رہتی تھی۔ لیکن ایوانے سے ملنے میں بھی وہ الیزانڈرا سے اس کی تمام کی تمام چیزیں لے لینا چاہتی تھی۔

اپنی پانچویں سالگرہ سے ایوانے الیزانڈرا کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔

سالگرہ سے ایک رات پہلے جب ایوانے یقین ہو گیا کہ اب سارے لوگ سو چکے ہیں۔ وہ الیزانڈرا کے بستر سے پاس کی

اور اسے جگا کر بولی۔ ”چلو باورچی خانے میں چل کر اپنی سالگرہ کے ایک دیکھیں۔“

”مگر سب لوگ سو رہے ہیں۔“ الیزا انڈرا نے آنکھیں ملے ہوئے کہا۔

”ہم کسی کو جگا نہیں گئے نہیں۔“ ایو نے کہا۔

”میڈم وائیل ڈونا اس بات کو پسند نہیں کریں گی۔“ الیزا انڈرا نے کہا۔ ”ہم سب کو دیکھ لیں گے۔“

”لیکن میں ابھی دیکھنا چاہتی ہوں۔“ ایو نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا میں ایکلی جاؤں۔“

الیزا انڈرا کو اتنی رات گئے سالگرہ کے کیک دیکھنے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنی بہن کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”میں چل رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”چلو۔“ ایو نے کہا۔ ”لیکن شور بالکل نہ کرنا۔“

دونوں بچیاں بالکل خاموشی سے نیچے اتر کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ اور ایو نے ریفریجریٹر خول کر اس میں رکھے ہوئے سالگرہ کے کیک دیکھے جو باورچن سز بلٹر نے بنائے تھے ان میں سے ایک ”پتی برتھ ڈے الیزا انڈرا“ اور دوسرے پر ”پتی برتھ ڈے ایو“ لکھا ہوا تھا۔

”اگلے سال ایک ہی کیک ہوگا۔“ ایو نے دل میں سوچا۔

ایو نے الیزا انڈرا کا ایک باہر نکال لیا اور باورچی خانے میں ایک دروازہ کھول کر اس میں سے رنگین تیلیوں کا ایک پیکٹ نکالا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ الیزا انڈرا نے پوچھا۔

”میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ جب اس پر موسم بتیاں جلیں گی تو یہ کیسا لگے گا؟“ ایو نے کہا۔

”یہ بات ٹھیک نہیں ہوگی۔“ الیزا انڈرا نے کہا۔ ”کیک خراب ہو جائے گا۔ سز بلٹر بہت ناراض ہوں گی۔“

”نہیں! وہ برا نہیں مانیں گی۔“ ایو نے کہا۔ ”آؤ میری مدد کرو۔“ اور اس نے ایک دوسری دروازہ کھول کر مایوس کی دو بڑی بڑی ڈیاں نکالیں۔

”میں واپس بستر پر جانا چاہتی ہوں۔“ الیزا انڈرا نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا جاؤ ڈر یوک بلی۔“ ایو نے نفرت سے کہا۔ ”میں خود ہی سب کچھ کر لوں گی۔“

”اچھا۔“ الیزا انڈرا نے جھپکتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

ایو نے اس کے ہاتھ میں مایوس کی ایک ڈیاں تھما دی۔ ”موسم بتیاں جلاؤ۔“

الیزا انڈرا آگ سے خوف زدہ تھی۔ دونوں بچوں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ کبھی آگ کے پاس نہ جائیں، لیکن

الیزا انڈرا ایو کو ایس بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک موسم بتی جلائے گی۔ ایو کی طرف الیزا انڈرا کی پشت تھی۔ ایو نے اپنے

ہاتھ میں بڑی ہوئی مایوس کی ایک تیلی جلائی اور پھر اس تیلی کو مایوس کی دوسری تیلیوں سے لگا دیا۔ ایک دم پوری ڈیاں جلنے لگی۔

اور ایو نے جلد سے اس جلتی ہوئی ڈیا کو الیزا انڈرا کے پیروں کے پاس اس طرح ڈال دیا کہ الیزا انڈرا کا نائٹ گاؤن اس کی زد

میں آ گیا۔ اس میں آگ لگ گئی۔ جب الیزا انڈرا نے اپنی ناگوں پر پیش محسوس کی تو وہ خوف زدہ ہو کر چلانے لگی۔

ایو نے جلتے ہوئے نائٹ گاؤن کو دیکھا۔ وہ اپنی کامیابی سے مطمئن تھی۔

”بنا نہیں۔“ ایو نے آہستہ سے الیزا انڈرا سے کہا۔ ”میں ابھی ایک بالٹی پانی لاتی ہوں۔“ اور اسٹور کی طرف چلی گئی۔

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ باورچن سز بلٹر جو کسی کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھی، عین اسی وقت گھر واپس آ گئی۔ اس نے

الیزا انڈرا کی چیخیں سیں۔ وہ اور اس کا ساتھی، دونوں تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے ہ خوفناک

منظر دیکھا۔ سز بلٹر کے ساتھی نے فوراً الیزا انڈرا کا نائٹ گاؤن نوچ کر پھینکا۔ اس کی ٹانگیں اور بولے بری طرح جل

گئے تھے۔ وہ فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال اور جسم کا سامنے کا حصہ جلنے سے بجے ہوئے تھے۔

سز بلٹر نے جلدی جلدی ایو بولٹس کے لیے فون کیا اور تب اسے اسٹور کی طرف سے ایک بیج کی آواز سنائی دی۔ اور پھر

ایو اصر سے ایک برتن میں پانی لیے ہوئے دوڑتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

”کیا الیزا انڈرا مر گئی؟“ ایو نے پوچھا۔ ”کیا وہ مر گئی؟“

سز بلٹر نے ایو کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ ”نہیں ڈارلنگ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”غلطی میری تھی۔“ ایو نے کہا۔ ”الیزا انڈرا اپنی سالگرہ کے کیک پر موسم بتیاں جلا نا چاہتی تھی۔ مجھے اس کو ایسا کرنے سے

روکنا چاہیے تھا۔“

”کوئی بات نہیں ڈیزر۔“ سز بلٹر نے ایو کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”اپنے آپ کو الزام مت دو۔“

”الیزا انڈرا کی ناگوں اور پشت پر دوسرے درجے کے جلنے

کے زخم ہیں۔“ ڈاکٹر ہارلے نے کیٹ کو بتایا۔ ”لیکن وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ کوئی نشان باقی نہیں رہے گا۔ یقین کرو یہ بہت بڑا المیہ ہو سکتا تھا۔“

”مجھے اس کا احساس ہے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”لیکن ڈاکٹر ہارلے مجھے اب الیکڑ انڈرا سے زیادہ ایوکی فگر ہے۔“

”وہ کیوں؟“ ہارلے نے پوچھا۔  
 ”وہ بے چاری بچی اپنے آپ کو الزام دے رہی ہے۔“ کیٹ نے کہا۔ ”وہ کہتی ہے کہ اس نے الیکڑ انڈرا کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن الیکڑ انڈرا نے اس کی بات نہیں مانی۔ وہ اپنی سالگرہ کے ٹیک پر موم بتیاں جلانے پر مصری۔ ایو کہتی ہے کہ اسے ہر قیمت پر الیکڑ انڈرا کو باورچی خانے میں جانے سے روکنا چاہیے تھا۔“

”یہ ایک غامضی احساس ہے کیٹ۔“ ہارلے نے کہا۔ ”کچھ دن بعد وہ اسے بھول جائے گی۔“

اس واقعے کے دو سال بعد جب دونوں بچیاں بہا ماس میں اپنی چھٹیاں منا رہی تھیں، الیکڑ انڈرا ایو کے ساتھ کھیلنے ہوئے بال بال بیٹی۔ وہ تقریباً ڈوب ہی گئی تھی کہ ایک مانی نے اسے بچالیا۔ ایو اپنی ناکامی پر سخت جھنجھائی۔ الیکڑ انڈرا کو اس نے تالاب میں دھکا دیا تھا۔

اس سے اگلے سال الیکڑ انڈرا ایک چٹان پر سے گر پڑی جہاں وہ ایو کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس نے چٹان کی ڈھلان پر اگی ہوئی ایک جھاڑی کو پکڑ کر اپنی جان بچائی۔

کیٹ پابندی سے ہر ماہ ٹوٹی کودیٹھنے جاتی تھی جو سینی ٹوریم میں تھا۔ اس کی طبیعت اب اس حد تک مستحضر گئی تھی کہ وہ پرسکون ہو گیا تھا اس میں اب تشدد کی کوئی علامت باقی نہیں رہی تھی لیکن اس کا دماغ اپنی اصل حالت پر واپس نہیں آتا تھا۔ ٹوٹی اب لوگوں کو پہچانتا تھا۔ وہ کیٹ کو کبھی پہچانتا تھا اور اس سے بڑی نرمی سے بات کرتے ہوئے ایو اور الیکڑ انڈرا کے بارے میں پوچھتا تھا لیکن اس نے ابھی اپنی بچپن کو دیکھنے کی خواہش نہیں ظاہر کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں رہی ہے۔

کیٹ نے سینی ٹوریم کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر برگر سے پوچھا: ”میرا بیٹا سارا دن کیا کرتا رہتا ہے؟“

”وہ گھٹنوں بیٹھا ہوا پیٹ کرتا رہتا ہے۔“ برگر نے جواب دیا۔

”میرا بیٹا۔“ کیٹ نے افسردگی سے سوچا۔ ”جو اتنی بڑی دولت کا مالک بن سکتا تھا۔ سارا دن بیٹھا ہوا پیٹ کرتا رہتا ہے

....

”وہ کیا پیٹ کرتا ہے؟“ کیٹ نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ برگر نے بتایا۔ ”بس کاغذ پر رنگ بھرتا رہتا ہے۔“

شروع شروع میں کیٹ کا خیال تھا کہ ٹوٹی ٹھیک ہو جائے گا اور وہ سینی ٹوریم سے واپس آ جائے گا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا یہ خواب دھندلا گیا۔

۱۹۶۲ء میں کیٹ نے اپنی ستر سالہ سالگرہ منائی۔ اس کے بال اب سفید ہو چکے تھے۔ لیکن اس کی جسمانی توانائی اب بھی قابل رشک تھی وہ کروگر برینٹ کمپنی کے لیے بے تحاشا کام کرتی تھی۔ وہ کمپنی کو اپنے خاندان کے لیے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ براڈ راجرس ایک اچھا منیجر تھا لیکن وہ اس کا اپنا آدمی تو نہیں تھا۔ ”مجھے اس وقت تک زندہ رہنا ہے جب تک کہ میری دو پوتیاں اس کمپنی کی مالک بننے کی عمر کو نہ پہنچ جائیں۔“ کیٹ سوچتی اس وقت ان دونوں لڑکیوں کی عمر بارہ سال کی تھی۔

کیٹ اپنے فحشیت کے زیادہ تر اوقات دونوں لڑکیوں کے ساتھ گزارتی تھی۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ انہیں مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

کیٹ کے لیے ایک اہم فیصلے کا وقت آ گیا تھا۔ دونوں لڑکیوں کی شخصیتیں بوجہ ہوا یک جہی تھیں، لیکن کیٹ کو ان کی شکایات کی کیسایت سے زیادہ ان کے ذہنوں کے فرق سے تعلق تھا۔ وہ دونوں لڑکیوں میں واضح فرق محسوس کرتی تھی۔ ایو تیز طرار حالاک، ہوشیار اور، ہن لڑکی تھی۔ کیٹ اس بات کو محسوس کرتی تھی کہ ایو اپنی بات منوانے کا ڈھنگ جانتی ہے۔ ایو کے اندر خود اعتمادی تھی، عزم اور حوصلہ تھا۔ اس کے مقابلے میں الیکڑ انڈرا نرم طبیعت کی، منتشر المزاج اور ایک سیدھی سادی سی نیک لڑکی تھی۔ ٹوٹی کے معاملات سنہنجانے کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت تھی وہ کیٹ کو ایو میں نظر آتی تھی، الیکڑ انڈرا میں نہیں۔

کیٹ کو یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی کہ وہ اپنا اصل وارث کسے بنائے گی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ کروگر برینٹ کمپنی کو ایو کے حوالے کرے گی۔ کمپنی کے اثاثوں کی مالیت اس وقت تقریباً دس ملین ڈالرز تھی! ”جب وہ ریٹائر ہو جائے گی تو ایو سارا کاروبار سنبھالے گی۔ اور جہاں تک الیکڑ انڈرا کا تعلق ہے تو وہ اتنی دولت اس کے نام کر دے گی جس سے وہ اپنی ساری زندگی عیش و عشرت کے ساتھ گزار سکے۔ کیٹ نے جو خیراتی فنڈ وغیرہ قائم کیے تھے، الیکڑ انڈرا ان



تفصیلات بیان کیں تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ پانچ بچوں کا باپ تھا۔

کیٹ نے دونوں لڑکیوں کو ایک دوسرے اسکول میں بھیج دیا۔

کچھ دنوں بعد اس اسکول کی ہیڈ مسٹر بیس نے کیٹ کو مطلع کیا کہ ایو کی آداریاں اس حد تک بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ اسے اپنے اسکول میں نہیں رکھ سکتی، اس لیے وہ اسے اسکول سے خارج کر رہی ہے کیونکہ ایو اسکول کی بدنامی کا باعث بن رہی ہے۔ ایو کے ساتھ الیکز انڈرا بھی گھر آگئی۔

ایو نے گھر آنے کے بعد اپنی دادی کو بتایا کہ دراصل یہ سارا کیا دھرا الیکز انڈرا کا ہے۔ ”الیکز انڈرا میرا نام اختیار کر کے مردوں سے تعلقات رکھتی ہے۔ لوگ ہم دونوں کو الگ الگ بہ مشکل ہی پہچان پاتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں معلوم ہے کہ الیکز انڈرا.... میرا مطلب ہے دادی اماں.... وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہتی ہے۔“ ایو کی آواز سرگوشی میں بدل گئی اور اس نے اپنی پٹلیں جھکا لیں۔ ”لیکن دادی اماں تم الیکز انڈرا سے اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔“

کیٹ شش و پنج میں تھی کہ ایو کی بات کو صحیح مانے یا نہ مانے۔ اسے الیکز انڈرا سے اس قسم کے رویے کی توقع نہیں تھی۔

اس سے اگلے دن مسز ونڈرلیک نے کیٹ کو فون کیا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جس سے کیٹ معمولی طور پر واقف تھی۔

”میں نے تمہاری ایک بولی کو چند منٹ پہلے کاؤنٹ الفریڈ کے ساتھ ایک بول سے نکلنے دیکھا ہے۔“ مسز ونڈرلیک نے کہا۔ ”وہ دونوں وہاں سے چھپ کر نکل رہے تھے۔“

”کاؤنٹ الفریڈ.... ایک شادی شدہ بچاس سالہ مرد....“ کیٹ کے دماغ میں آنکھیں چلنے لگیں۔ اسے معلوم تھا کہ

الیکز انڈرا گھر پر ہے۔ ایو باہر تھی۔ ایو جب واپس آئی تو کیٹ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ ”اس نے الفریڈ کے ساتھ اپنی ملاقات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔“

”کیا تم کاؤنٹ الفریڈ کے ساتھ بول کے کمرے میں تھیں۔“ کیٹ کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

ایو کا سر چمکانے لگا۔ ایسا کیونکر ممکن ہو سکا؟ دادی جان کو فوراً ہی اس بات کا پتا کیونکر چل گیا؟

”دادی جان وہ مجھے راستے میں مل گیا....“ ایو نے چالاکی سے کہا۔ ”اس نے میرے ساتھ زبردستی کی....“

”بندر کو یہ اداکاری۔“ کیٹ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ دونوں لڑکیوں کے بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات کیٹ

کا کام سنبھالے گی۔ وہ بڑی ہمدرد اور غم گسار طبیعت کی بچی ہے....“ کیٹ نے سوچا۔

الیکز انڈرا کے ساتھ اب بھی کٹر حادثے ہوتے رہتے تھے جن میں وہ کئی بار مرنے سے بال بال بچتی۔ کیٹ جبران تھی کہ الیکز انڈرا کے ساتھ بار بار ایسا کیوں ہوتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد دونوں بچیوں کو جنوبی کارولینا کے ایک شان دار اور معروف اسکول میں بھیج دیا گیا۔ ایو تھا اس اسکول میں جانا چاہتی تھی، لیکن کیٹ کا فیصلہ تھا کہ الیکز انڈرا اس کے ساتھ جائے گی۔

جب دونوں لڑکیوں کی پندرہویں سالگرہ کا وقت آیا تو کیٹ نے ایک شاندار پارٹی منعقد کی جس میں بہت سے نوجوانوں نے بھی شرکت کی کیٹ کی نظریں اب کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھیں جو آئندہ چل کر ایو کا شوہر بن سکے کوئی ایسا باصلاحیت ذہین اور ہوشیار نوجوان جو مستقبل میں کروڑ پرینٹ کمپنی کے کاروبار کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ایو اس موقع پر بہت خوش تھی اور وہ بہت سے نوجوان لڑکوں کے جھرمٹ میں اپنے آپ کو کسی ملکہ کی طرح محسوس کر رہی تھی۔

الیکز انڈرا کو پارٹیوں وغیرہ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ڈاک بار برادری، سیڈ اربل ہاؤس میں اپنے باپ کو اس کی بیٹی کی تصویروں کو گھنٹوں دیکھا کرتی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ کاش وہ اپنے باپ کو اس وقت دیکھ سکتی جب کہ وہ پہچانیں ہوا تھا۔ اس کا باپ اکثر تعلیمات کے موقع پر سینی ٹورم کے ایک مدرسے کے ساتھ گھر آتا تھا۔ وہ ان لوگوں کے لیے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک خاموش طبع اور نرم مزاج اجنبی جو کچھ بھی نہیں کہتا تھا، کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ الیکز انڈرا کا نانا اس کی ماں ماریان کا باپ فریڈرک جوفین بزنس میں رہتا تھا اور کبھی کبھی اپنی نواسیوں سے ملنے آ جاتا کرتا تھا۔

اسکول کی ہیڈ مسٹر بیس نے جب کیٹ کو اطلاع دی کہ وہ نارا کیٹ سے مل کر کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہے تو کیٹ سارے کام چھوڑ کر اس کے پاس پہنچی۔

”ایو ماں بننے والی ہے۔“ ہیڈ مسٹر بیس نے کیٹ کو بتایا۔ کیٹ کو اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ایو نے اپنے انگریزی زبان کے استاد پر الزام لگایا کہ اس نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔ استاد کا کہنا تھا کہ ایو خود موقع پا کر اس کے گھر میں گھس آئی تھی اور اس نے اسے مجبور کیا تھا۔ استاد کو اسکول سے نکال دیا گیا اور ایو ایک ڈاکٹر نے اس پر بیٹائی سے نجات دلائی۔ استاد نے جس وقت اس واقعے کی

کی شکل بگاڑ دی، ایک احمق پوتی، اور اس کا احمق شوہر جو اکاؤنٹ کی کتابیں پڑھنے کے بجائے انسانی دماغ کو پڑھنا زیادہ پسند کرتا ہے اور یہ ننھا رابرٹ، کروگر برینٹ کا اگلا وارث....

رابرٹ اپنی ماں کی دادی کے پاس آ گیا اور کیٹ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تمہاری سالگرہ کی پارٹی بہت شاندار رہی۔ دادی اماں۔“ ننھے رابرٹ نے کہا۔

”شکریہ رابرٹ۔“ کیٹ نے کہا۔ ”تمہاری پڑھائی کا کیا حال ہے؟“

”میں اپنی کلاس میں سب سے آگے ہوں۔“ رابرٹ نے فخر سے کہا۔ ”مجھے میوزک میں تو خاص طور سے سب سے زیادہ نمبر ملتے ہیں۔“

”رابرٹ کہتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر موسیقار رہے گا۔“ رابرٹ کے باپ پیٹر نے کیٹ سے کہا۔ ”اس کے اساتذہ کہتے ہیں کہ اس کے اندر ایک اعلا درجے کا موسیقار بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ رابرٹ کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو پیٹر۔“ کیٹ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میں اب بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔ اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں کسی معاملے میں مداخلت کروں۔ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔“

کیٹ نے ایک آخری نظر اپنے بیٹے ٹونی پر ڈالی جو خالی خالی نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی.....

”کروگر برینٹ کہیں کو کون چلائے گا؟“ اپنی نوے سالہ سالگرہ کے موقع پر وہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی!

☆☆☆

کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ الیکو انڈرا کے ساتھ پیش آنے والے بے درجے حادثات، اسکول میں ایوکا اپنے نیچر پر الزام لگانا اور پھر آوارگی کے الزام میں اس کا اسکول سے نکالا جانا اور اس کا الیکو انڈرا کو مورد الزام قرار دے دینا.... کیٹ کی نظروں کے سامنے سے سارے پردے ہٹتے جا رہے تھے۔ اس نے ایوکا اصل روپ دیکھ لیا تھا۔

”میں تمہیں بلک ویل خاندان کی عزت کو سرعام نیلام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی، تم ایک فاحشہ ہو۔ شاید میں یہ بھی برداشت کر لیتی۔ لیکن تم ایک فاحشہ ہونے کے ساتھ ساتھ فریبی، مکار دھوکے باز اور جھوٹی بھی ہو۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں عاق کرتی ہوں۔“

کیٹ نے اسی دن ایوکا کو قحط کر کے گھر سے نکال دیا۔ اس نے اپنی وصیت نئے سرے سے ترتیب دی جس میں اس نے الیکو انڈرا کو اپنا وارث قرار دیا اور ایوکا کے لیے ڈھائی سو ڈالرنی ہفتہ کا ایک الاؤنس مقرر کر دیا۔ لیکن ایوکا اس کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ایوکا اسی دن گھر سے چلی گئی۔

کچھ برسوں کے بعد ایوکا نے ایک پلاسٹک سرجن سے شادی کر لی لیکن وہ دوسرے مردوں سے بھی تعلقات رکھتی تھی۔ اس کے شوہر نے جو پلاسٹک سرجری کا ماہر تھا۔ اس کی حسین شکل بگاڑ دی۔ اس لیے کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اب ایوکا کی جو کر رہے گی اور اس کا سوچنا ٹھیک تھا!

الیکو انڈرا نے ایک ماہر نفسیات سے شادی کر لی۔ کیٹ چاہتی تھی کہ الیکو انڈرا کسی ایسے شخص سے شادی کر لے جو کاروباری ذہن رکھنے والا آدمی ہوتا کہ وہ کروگر برینٹ اپنی کو سنبھال سکے لیکن اسے باؤل ناخواستہ الیکو انڈرا کی پسند کو قبول کرنا ہی پڑا۔ الیکو انڈرا کے شوہر پیٹر نے صاف کہہ دیا کہ وہ کاروبار کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور کبھی سے ٹونی سرہانہ نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ انسانی ذہن کو پڑھنے کا کام کرتا ہے اور اسے اپنا کام پسند ہے وہ اکاؤنٹ کی کتابیں نہیں پڑھنا چاہتا ایک سال بعد الیکو انڈرا کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے رابرٹ رکھا۔

کیٹ کی نوے سالہ سالگرہ کی تقریب ختم ہو چکی تھی۔ اور.... خاندان کے افراد اس کے گرد جمع تھے۔ ٹونی، ایوکا، الیکو انڈرا، ان دونوں کے شوہر اور ننھا رابرٹ۔

”یہ ہے میرا خاندان۔“ کیٹ نے افسردگی سے سوچا۔ ”ایک جنونی قاتل بیٹا۔ ایک فاحشہ پوتی جس کے شوہر نے اس